احادیث معاملات

مقاصد شریعت کے پس منظر میں

مولانا شہباز عالم ندوی

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

نام کتاب: احادیث معاملات — مقاصد شریعت کے پس منظر میں
مؤلف: مولانا شہباز عالم ندوی
صفحات: ۱۵۸
قیمت:

ناشر
اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)
161 — ایف، جوگابائی، پوسٹ باکس نمبر: 9746
جامعہ نگر، نئی دہلی — ۱۱۰۰۲۵
ای میل: fiqhacademyindia@gmail.com
فون: 011-26981779

بسم الله الرحمن الرحيم

(صفحہ نمبر درست کرنا ہوگا)

فہرست

عنوان	صفحہ
پیش لفظ — مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۹
مقدمہ۔ مقاصد شریعت کی تاریخ	۱۱
تمہید۔ احادیث معاملات مقاصد شریعت کے پس منظر میں	۲۱
باب اول: مقاصد شریعت	۲۶
تحفظ دین	۴۰
تحفظ جان	۴۱
تحفظ عقل	۴۲
تحفظ نسل	۴۳
تحفظ مال	۴۳
ضروریات	۴۸
حاجیات	۵۰
تحسینیات	۵۲
مقاصد شریعت کی تقسیم	۵۳
پہلی تقسیم: درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے	۵۴
دوسری تقسیم: مقصود کے اعتبار سے	۵۴
تیسری قسم: وسعت وجامعیت کے اعتبار سے	۵۴
۱۔ مقاصد عامہ	۵۴
۲۔ مقاصد خاصہ	۵۵

۳۔مقاصد جزئیہ	۵۵
چوتھی تقسیم: یقین وظن کے اعتبار سے	۵۵
۱۔مقاصد قطعیہ	۵۵
۲۔مقاصد ظنیہ	۵۶
۳۔مقاصد وہمیہ	۵۶
پانچویں قسم: افراد کے اعتبار سے	۵۶
مقاصد کلیہ	۵۶
مقاصد بعضیہ	۵۷
مکملات مقاصد	۵۸
خلاصہ	۶۰
باب دوم: معاملات کی اہمیت	۶۱
مالی معاملات میں کمزوری کے نقصانات	۶۳
تجارت دین سے جدا نہیں	۶۴
وقت کی اہم ضرورت	۶۵
حکمتوں اور مصالح پر احکام شریعت کی بنیاد	۶۵
اسلامی تصور مال	۶۹
مال ودولت کی اہمیت قرآن وحدیث کی روشنی میں	۶۹
۱۔تمام مال ملکیت الہیہ ہے	۷۶
ملکیت کا اسلامی تصور	۸۲
اسلام کے معاشی مقاصد	۸۶
باب سوم: مال مقاصد شریعت کی روشنی میں	۹۱
سود کے نقصانات	۹۷

اخلاقی نقصانات	۹۷
ربا الفضل اور ربا النسیہ کی حرمت کا سبب	۹۸
جوا کی تعریف	۱۰۰
جوئے کی شکلیں	۱۰۳
قمار کے سماجی اور اجتماعی نقصانات	۱۰۴
معاملات میں ضرر کا دخل	۱۰۷
مقاصد شریعت کی تکمیل	۱۱۵
باب چہارم: اسلامی مالیاتی نظام	۱۱۶
اسلام کا نظام معیشت	۱۱۶
معاشی نظام کے اہم ادارے	۱۱۹
روایتی بینکاری	۱۲۱
اسلامی بینکنگ اور غیر سودی بینکنگ کا فرق	۱۲۱
مشارکہ	۱۲۳
ثبوت شرکت کی عقلی دلیل	۱۲۵
احادیث مبارکہ سے شرکت کا ثبوت	۱۲۶
مشارکہ متناقصہ	۱۲۷
مضاربہ	۱۲۹
مضاربہ کی مشروعیت کے دلائل	۱۲۹
تورق	۱۳۱
بیع عینہ	۱۳۴
بینکوں میں رائج عینہ پر ایک نظر	۱۳۴
مرابحہ	۱۳۷

مرابحہ کی مشروعیت	۱۴۰
اجارہ	۱۴۱
اجارہ کی مشروعیت قرآن مجید سے	۱۴۱
اجارہ کی مشروعیت احادیث مبارکہ سے	۱۴۲
اجارہ کی اہمیت اور ضرورت	۱۴۳
اجارہ بطریقۂ تمویل	۱۴۴
اجارہ اور اجارہ منتہیہ بالتملیک کی مشروعیت پر بنیادی باتیں	۱۴۵
مساقات ومزارعت	۱۴۵
عقد استصناع کی مشروعیت اور اس کا حکم شرعی	۱۴۶
عقد استصناع کے لئے ضابطہ اور اصول	۱۴۷
استصناع اور اس کی ضمانتیں	۱۴۷
عقد سلم	۱۴۹
سلم کے جواز کی حکمت	۱۵۰
خلاصہ	۱۵۲
اسلامی نظام معیشت کے بنیادی خدوخال	۱۵۲
۱۔حصول رزق کے لئے حلال ذرائع کا استعمال	۱۵۲
۲۔صرف دولت کی ترغیب مگر حدود کے اندر	۱۵۲
۳۔مال ودولت جمع کرنے کی ممانعت	۱۵۳
۴۔گردشِ دولت کے فروغ کا اہتمام	۱۵۳

پیش لفظ

دین اسلام یا شریعت اسلامی پوری انسانی زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشہ کو محیط ہے، خواہ وہ عقائد وعبادات سے متعلق ہوں یا عقود ومعاملات سے، احکام شریعت کی حکمت ومصلحت کی بنیاد مقاصد شریعت ہے، جس کے ذریعہ انسانی جان ومال، دین وعقل اور نسل یعنی مقاصد خمسہ کی حفاظت، انسانی زندگی میں توازن واعتدال، اور انسانی زندگی کی فلاح وبہبود کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے جن کاموں سے منع کیا یا جن چیزوں کے کرنے کا حکم دیا اس کے پیچھے حکمت ومصلحت یا علت وسبب موجود ہے، اسی علت وسبب یا حکمت ومصلحت کو سامنے رکھ کر علماء ومفتیان نئے مسائل کا حل پیش کرتے ہیں اور ان کا حکم بیان کر کے امت کی رہنمائی کرتے ہیں۔

شریعت اسلامی نے جس طرح عبادات سے متعلق احکام بیان کئے ہیں ٹھیک اسی طرح معاملات سے متعلق تفصیلی احکام بیان کئے ہیں، چونکہ انسان کی بقا وتسلسل اور اس کی ترقی کا دار ومدار جن معاملات پر ہے ان میں دو معاملے یعنی عقد نکاح اور عقد بیع بنیادی اہمیت کے حامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے عبادات ومناکحات کے بعد معاملات کو فقہ اسلامی کا ناگزیر حصہ قرار دیا ہے، جس کے تحت انسان کی پوری اقتصادی زندگی یعنی تجارت، لین دین، اور پوری معاشی سرگرمیاں آتی ہیں، چنانچہ اس کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ معاشرہ کے دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان باہمی حاجت وضرورت کی بنا پر جو مالی یا معاشی تعلق قائم ہوتا ہے اسے ''معاملہ'' کہتے ہیں۔

معاملات کے تعلق سے شریعت اسلامی نے تفصیلی اصول وضوابط بیان کئے ہیں، بعض دفعہ ان کی حکمتوں اور مصلحتوں کا ذکر کیا ہے، اور ان کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے، صاحب کتاب

نے اس کتاب کے پہلے باب میں معاملات سے متعلق شریعت کے مقاصد کو مختلف حوالوں سے تفصیل سے ذکر کیا ہے، مقدمہ میں مقاصد کی لغوی واصطلاحی تعریفات کے ساتھ ساتھ مقاصد شریعت پر کام کرنے والوں اور ان کی کتابوں سے متعلق گفتگو کی ہے، مقاصد شریعت کے اقسام پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرے باب میں معاملات کی اہمیت، اموال کی اقسام اور اس کے ضمن میں معاملات سے متعلق اعمال، اسی طرح ملکیت کا اسلامی تصور، اسلام کے معاشی مقاصد کو پیش کیا ہے۔تیسرے باب میں صرف مال سے بحث کی ہے، اور اس کے تحت سود کے نقصانات، قمار کے سماجی اور اجتماعی نقصانات اور قمار کی شکلوں وغیرہ کو بیان کیا ہے۔ چوتھے باب میں اسلامی مالیاتی نظام پر روشنی ڈالی ہے، اور اس کے ضمن میں اسلام کا نظام معیشت، معاشی نظام کے اہم ادارے، اسلامی بینکنگ اور غیر سودی بینکنگ کا فرق، مشارکت، مضاربہ، تورق، بیع عینہ، مرابحہ، اجارہ، عقد استصناع، سَلَم، مساقات ومزارعت جیسے عنوانات قائم کر کے ان پر مدلل بحث کی ہے۔

اللہ تعالی جزائے خیر دے عزیزی مفتی شہباز عالم ندوی کو کہ انہوں نے بڑی محنت اور جانفشانی سے اس کتاب کو مرتب کیا کہ اب تک اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب نہیں تھی، اللہ تعالی اس کتاب کو مرتب کے لئے ذخیرہ آخرت بنائے اور اہل علم ودانش کو اس سے استفادہ کی توفیق بخشے، آمین، واللہ ولی التوفیق۔

خالد سیف اللہ رحمانی
(جنرل سکریٹری)

مقدمہ

مقاصد شریعت کی تاریخ:

مقاصد شریعت کا موضوع ان شرعی موضوعات میں سے ہے، جن پر تاریخ اسلامی کے اوائل میں فقہاء نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی، اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی مسالک کے فقہی ذخیروں میں خاص مقاصد شریعت پر تحریریں بعد میں لکھی گئی ہیں، بلکہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ اصول فقہ کے نصاب میں متعدد ایسی کتابیں اب تک شامل چلی آرہی ہیں جن کے زیر بحث موضوعات میں مقاصد شریعت کا تذکرہ تک نہیں پایا جاتا۔

گویا ابتدائی تین صدیوں کے اصحاب علم نے مقاصد شریعت پر بہت زیادہ توجہ نہیں دی، بلکہ اس وقت تک تو فقہاء کی تحریروں میں مقاصد کا لفظ بھی استعمال ہونا شروع نہیں ہوا تھا، پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حکیم ترمذی (۲۷۵ء) جو تیسری صدی ہجری کے ہیں انہوں نے اپنی کتابوں کے لئے مقاصد اور علم کا لفظ استعمال کیا۔ ان کی کتاب ہے "**الصلاة ومقاصدها**" نیز "**الحج وأسراره**" ان میں انہوں نے عبودیت اور احکام اسلام کے مقاصد پر گفتگو کی ہے، حکیم ترمذی نے گویا سب سے پہلے اس پر کام شروع کیا۔ اسی طرح انہوں نے "الفروق" کے نام سے بھی ایک رسالہ لکھا۔ ان کے بعد ابو منصور ماتریدی (۳۳۳ھ) جن کی کتاب عقائد کے موضوع پر زیادہ مشہور ہیں، انہوں نے مقاصد شریعت پر "مأخذ الشرائع" نام سے ایک کتاب لکھی۔ ابوبکر قفال الشاشی (۳۶۵ھ) جو قفال کبیر سے مشہور ہیں، ان کی کتاب "محاسن الشریعہ" ہے جس میں انہوں نے اسرار وعلل کے موضوع پر گفتگو کی ہے۔ ابوبکر آبہری (۳۷۵ھ) کی کتاب "مسئلة الجواب والدلائل والعلل" کا تعلق بھی اسی موضوع سے ہے۔ امام باقلانی

(۴۰۳ھ) کی ''المقنع فی اصول الفقہ'' اور ''الاحکام والعلل'' ہے۔ ان کتابوں میں انہوں نے اسی موضوع پر ابتدائی درجے کی گفتگو کی ہے۔

یہ سب کی سب شریعت کے اسرار اور مقاصد وحکمت پر کوششیں تھیں۔ لیکن امام الحرمین جوینیؒ (۴۷۸ھ/ ۱۰۸۵ء) نے جو شافعی اصولیین میں شمار ہوتے ہیں، آپ نے پہلی مرتبہ مقاصد شریعت کی اصطلاح استعمال کی تھی اور پہلی دفعہ ایک خاص ترتیب سے شریعت کے اغراض ومقاصد اور شرعی احکام کے علل پر بحث کی (محمد نجات اللہ صدیقی: مقاصد شریعت، اسلام آباد، ادارہ تحقیقات اسلامی، ۲۰۱۴ء)۔ اصول فقہ پر ان کی کتاب ''البرہان'' میں مقصد، مقاصد اور قصد وغیرہ الفاظ کثرت سے استعمال کئے گئے ہیں۔ مگر نئے اجتہاد کے آلہ کے طور پر مقاصد شریعت کا مؤثر استعمال ان کی دوسری کتاب ''الغیاثی'' میں کیا گیا ہے (امام الحرمین الجوینی: الغیاثی (غیاث الامام فی التیاث الظلم) قطر، ۱۴۰۱ھ)، الغیاثی انتہائی اہم کتاب ہے، اس کتاب کے محقق ڈاکٹر عبدالعظیم الدیب ہیں۔ کتاب کا پورا نام ''غیاث الامم فی التیاث الظلم'' ہے اور یہ پہلی کتاب ہے جسے تاریخ فکر مقاصدی کے میدان میں بیج کہا جاسکتا ہے یہ کتاب جوینی نے نظام الملک کے لئے لکھی تھی جو الپ ارسلان کے وزیر تھے، بعد میں ملک شاہ کے بھی وزیر رہے (امام الحرمین الجوینی: مقدمہ از عبدالعظیم الدیب، صفحہ ۶۰)۔

پھر امام جوینی کے شاگرد امام غزالی (۵۰۵ھ) آئے تو انہوں نے اس علم سے اعتنا شروع کیا اور نظریۂ مقاصد کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انہوں نے ہی مصالح کی تین قسمیں بتائیں: (۱) ضروری، (۲) حاجی، (۳) تحسینی۔ امام غزالی نے جوینی کے افکار کو ترقی دیتے ہوئے عام مصلحت اور تعلیل کی بابت متعدد مسائل پر تفصیلی کلام کیا، یہ کلام ان کی دو کتابوں شفاء العلیل اور المستصفی میں ملتا ہے۔ مصلحت کو دلیل بنائے جانے کی جو رائے امام غزالی نے پیش کی تھی اسے اگر علی الاطلاق مانا جائے تو محل نظر ہے، لیکن انہوں نے اس مصلحت کو ایسی دلیل بتایا جو مقاصد شریعت کو تقویت دے۔ غزالی کا دوسرا کارنامہ یہ ہے کہ

انہوں نے مصالح یا مقاصد کی ایک فہرست مرتب کردی جو آج تک ہماری رہنمائی کررہی ہے، پہلی بار انہوں نے یہ بات وضاحت سے لکھی کہ ''**مقصود الشرع من الخلق خمسة وهو أن يحفظ عليهم دينهم ونفسهم وعقلهم ونسلهم ومالهم**'' کہ شریعت ان پانچ اہداف کے حصول کو یقینی بناتی ہے: حفاظت دین، حفاظت زندگی، حفاظت عقل، حفاظت نسل اور حفاظت ملکیت، ان پانچ امور کی حفاظت اولین درجہ میں واجب ہے (ابوحامد محمد الغزالی، المستصفی من علماء الاصول، قاہرہ: المکتبۃ التجاریہ ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء، ۱/۲۸۷)۔ پھر انہیں دینی اور دنیوی مقاصد کے اعتبار سے تقسیم بھی کیا۔ امام غزالیؒ (۵۰۵) کہتے ہیں: کبھی یہ مقاصد جلب منفعت کے ساتھ حاصل ہوتے ہیں اور کبھی ان مقاصد کو کسی ضرر سے محفوظ کرتے ہوئے باقی رکھ کر حاصل کیا جاتا ہے (امام ابو حامد الغزالی، شفاء العلیل فی بیان الشبہ والمخیل ومسالک التعلیل/۱۶۱۔ ۱۶۲، بغداد: مطبعۃ الارشاد، ۱۹۷۱ء)۔

چنانچہ ان پانچ مقاصد کی حفاظت کو مصلحت اور ان میں واقع خلل کو مفسدہ قرار دیا، پھر ان مقاصد شریعت کی درجہ بندی کرتے ہوئے امام غزالیؒ (۵۰۵) نے اپنے شیخ جوینیؒ (۴۷۸ھ) کے پانچ درجات مقاصد کو تین درجات ضرورت، حاجت، اور تحسینیات میں سمو دیا (الغزالی، مصدر سابق/۱۵۹۔ ۱۶۲)۔ غزالی نے یہ بھی بتایا کہ مصلحت پہچانی کیسے جاتی ہے، ''ہم نے مصلحت کا مدار مقاصد شریعت کے تحفظ پر رکھا ہے اور مقاصد شریعت کو کتاب، سنت اور اجماع کے ذریعہ جانا جاتا ہے۔ چنانچہ کوئی ایسی مصلحت جس کا تعلق کسی ایسے مقصد کی حفاظت سے نہ ہو جسے کتاب، سنت اور اجماع سے سمجھا گیا ہو، یا جو ایسی نامانوس مصلحت ہو جو شریعت سے مناسبت نہ رکھتی ہو تو ایسی مصلحت باطل ہے، اسے رد کردیا جائے گا اور جو اس کی پیروی کرے گا وہ بدعت کا مرتکب قرار پائے گا'' (ابوحامد الغزالی: المستصفی فی اصول الفقہ ۱/۳۱۰، قاہرہ: مطبعہ امیریہ، بولاق ۱۳۲۲ھ) ان دونوں کے بعد سب سے بڑا کام جو مقاصد شریعت پر ہوا ہے وہ علامہ شاطبی کا ہے۔ علامہ شاطبی کی ''الموافقات'' کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ

اس موضوع پر سب سے بڑی اور اہم ترین کتاب ہے، البتہ تھوڑی سی مشکل یہ ہے کہ مسائل کو پیش کرنے میں ان کا جو اسلوب ہے، کہیں کہیں بہت دشوار ہوجاتا ہے، وہ جو کہنا چاہتے ہیں بسا اوقات اس کا سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے۔

امام شاطبی کے علاوہ امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) نے بھی اس میدان میں خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی کتاب ''المحصول'' ہے جو کہ ابوالحسین کی کتاب ''المعتمد''، امام غزالی کی ''المستصفی'' اور جوینی کی ''البرہان'' کی تلخیص ہے۔

پھر متعدد ممتاز اصحاب قلم نے مقاصد کے موضوع پر قلم اٹھایا، ان حضرات کی تحریریں اگرچہ کسی متعین نہج پر قائم نہیں تھیں، لیکن انہوں نے مقاصدی افکار کے ارتقاء میں نہایت اہم کردار ادا کیا، مثلاً سیف الدین آمدید (متوفی ۶۳۲ھ/ ۱۲۲۲ء) ان کی کتاب ''الاحکام فی اصول الاحکام'' ہے۔ انہوں نے امام فخر الدین رازی کی طرح ہی مذکورہ کتابوں کی تلخیص کی، اسی طرح انہوں نے مختلف قیاسوں کے درمیان تعارض کی صورت میں مقاصد کو معیار ترجیحات میں بہتر قرار دیا ہے/شمار کیا ہے۔ انہوں نے مقاصد کی مختلف قسموں کے درمیان ترجیح کی ترتیب پر ایک تفصیلی بحث سپرد قلم کی، آمدی نے مقاصد شریعت کو پانچ مقاصد تک ہی محدود رکھا، لیکن مشہور مالکی فقیہ شہاب الدین قرافی (متوفی ۶۸۴ھ/ ۱۲۸۵ء) نے ان میں ایک مقصد کا مزید اضافہ کیا، یعنی: حفاظت آبرو، ان کے اس نظریہ کی تائید تاج الدین عبدالوہاب بن السبکی (متوفی ۷۷۱ھ/ ۱۳۷۰ء) اور بعد میں محمد بن علی الشوکانی (متوفی ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۴ء) نے کی۔ عزالدین عبدالسلام السلمی (متوفی ۶۶۰ھ/ ۱۲۶۲ء) نے ایک مشہور کتاب ''قواعد الاحکام'' تصنیف فرمائی، جس کے بارے میں انہوں نے خود لکھا ہے کہ اس میں انہوں نے پیشروں سے کہیں زیادہ تفصیل کے ساتھ ''مقاصد احکام'' پر کلام کیا ہے۔ ان کے بعد امام نجم الدین الطوفی (۷۱۶ھ) آئے، انہوں نے مصلحت کے موضوع پر گفتگو کی۔ حدیث ''لاضرر ولاضرار'' کی شرح پر ان کا رسالہ شیخ رشید رضا نے طبع کرایا، یہ گویا ایک فکری بم تھا، جس میں

انہوں نے کہا تھا کہ مصلحت اجماع پر مقدم ہوگی۔ اس کے بعد کے دور میں ہم دیکھتے ہیں تو امام ابن تیمیہ اور ابن القیم وغیرہ انہوں نے اس موضوع پر باضابطہ کوئی کتاب تو نہیں لکھی ہے، لیکن ان کتابوں کے اندر ایسی بہت سی بحثیں ملتی ہیں، جن کا شریعت کے عام مقاصد اور احکام کے خاص مقاصد سے گہرا تعلق ہے۔

غالباً تقی الدین بن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ/ ۱۳۲۸ء) مذکورہ بالا تعداد (پانچ یا چھ) میں شریعت کے ضروری مقاصد کے محدود ہونے کے نظریہ سے آزاد پہلے شخص تھے، چنانچہ انہوں نے اس فہرست میں متعدد امور کا مزید اضافہ کیا جیسے: وفائے عہد، قرابت خداوندی، اخلاق، امانت داری، اور اخلاق کی حفاظت کا اضافہ کیا (تقی الدین ابن تیمیہ، مجموعہ فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ/ ۱۳۲۔ ۱۳۴، جمع: عبد الرحمن بن قاسم، بیروت، موسسۃ الرسالہ ۱۳۹۸ھ)، اسی چیز نے امام طاہر بن عاشور وغیرہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مساوات اور آزادی کو بھی مقاصد شرع میں شامل کریں، دراصل ابن تیمیہ کے عمل سے یہ فکر اور تحریک پیدا ہوئی کہ جو کچھ امام جوینی، امام غزالی اور قرافی وغیرہ نے ذکر کیا اس پر ہمیں اضافہ کرنا چاہئے، یہ حقیقت ہے کہ حریت اور آزادی اسلامی بنیادی ترجیحات میں آنی چاہئے، کیوں کہ امت مسلمہ جب تک آزادی سے محروم رہے گی وہ ہرگز اپنا استحکام حاصل نہیں کر سکے گی، اس لئے حریت کا مسئلہ نمایاں مقام پر آنا چاہئے۔ امام ابن تیمیہ نے اس کا دروازہ کھولا ہے، اور یہ آج بھی کھلا ہوا ہے۔ اسی طرح امام ابن تیمیہ نے قیاس کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا کہ قیاس صحیح ہمیشہ مقاصد کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ ابن القیم (۷۵۱ھ) نے اپنی کتاب ''اعلام الموقعین'' اور ''الطرق الحکمیہ'' وغیرہ میں اس موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، یا یہ کہہ لیں کہ انہوں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی باتوں کو مزید تفصیل اور صفائی و گہرائی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ روایتی فہرست کا ذکر کرتے وقت ابن تیمیہ نے نسل، کو نکال کر اس کی جگہ ''عزت و آبرو'' رکھ دیا۔ نیز یہ کہ غزالی وغیرہ کی ترتیب کے برعکس دین، کو اپنی

فہرست میں آخری نمبر پر رکھا، خلاصہ یہ کہ امام غزالی اور شاطبی کے کارناموں کی وجہ سے مقاصد شریعت کی فہرست پنج گانہ اور اس کی مخصوص ترتیب کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی مگر اہل علم اس باب میں ہمیشہ توسع کی طرف مائل رہے ہیں۔

علامہ شاطبی کے بعد اصول فقہ کی کتابوں میں ضمنی طور پر تو بحثیں مقاصد شریعت سے متعلق ضرور ملتی ہیں، لیکن باقاعدہ کوئی بحث اس موضوع پر اصولیین کے یہاں نہیں ملتی ہے۔ کوئی نیا کام اور کوئی نیا اضافہ بھی نظر نہیں آتا ہے، بلکہ اس کے برخلاف ایک طویل سناٹا نظر آتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کا کام مقاصد شریعت پر حجۃ اللہ البالغہ میں ضرور ہے، لیکن اس کی نوعیت دوسری ہے، وہ دوسرے انداز سے بہت ہی غیر معمولی کام ہے، اس لئے کہ ان کے بعد دور عقلیت آنے والا تھا، اس کے لئے شاہ صاحب نے بند باندھا، گویا پورے دین کو عقل کے پیرائے میں اور استدلال کے پیرائے میں پیش کر دیا تا کہ جب دور عقلیت آئے تو ہمارے علماء کو دین کی ترجمانی میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

مقاصد شریعت کی طرف حالیہ توجہ:

پھر انیسویں اور بیسویں صدی میں اس موضوع کو خاصی اہمیت حاصل ہوئی، علامہ طاہر بن عاشور جو تیونس کے ایک بڑے عالم تھے، انہوں نے کتاب لکھی ''مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ'' یہ کتاب بہت ہی عظیم اور ضخیم ہے، انہوں نے علامہ شاطبی ہی کی طرح مقاصد شریعت کو موضوع بنایا ہے، گویا علامہ شاطبی کے کام کو آگے بڑھایا ہے اور اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ایک طرح سے نئی تقسیم کی ہے کہ مقاصد دو طرح کے ہیں، ایک تو مقاصد عامہ ہیں، یعنی وہ مصالح اور معانی جو شریعت کے سارے یا اکثر ابواب میں شارع کو ملحوظ ہیں، اور ایک ہے مقاصد خاصہ جو کسی خاص باب میں شریعت کو مطلوب ہیں مثلاً بیع میں، رہن میں، اور نکاح میں شریعت کے کیا مقاصد ہیں؟ اس پر انہوں نے الگ سے مقاصد خاصہ کا عنوان لگایا ہے اور اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے، پھر مقاصد جزئیہ یا تیسری قسم انہوں نے قائم کی ہے، جس میں شریعت کے

مختلف احکام، ہر ایک حکم کی مصلحت اور اس کے مقصد پر انہوں نے گفتگو کی ہے۔ ان کے ایک اہم معاصر مراکش کے شیخ علال الفاسی (۱۹۰۸۔ ۱۹۷۴ء) بھی تیونس ہی کے تھے اور غیر معمولی صاحب فکر اور صاحب علم تھے، انہوں نے بھی "مقاصد الشريعة الإسلامية و مكارمها" کے نام سے کتاب لکھی، وہ کتاب بھی بہت فکر انگیز ہے، اس کتاب میں انہوں نے عدل وانصاف قائم کرنے اور ہر فرد کے لئے فکری آزادی اور نفسیاتی اطمینان وسکون کی ضمانت دینے کو مقاصد شریعت میں شمار کیا ہے (علال الفاسی: مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ ومکارمھا/ ۷، الدار البیضاء، ۱۹۸۳ء) اگر چہ ہر زمانہ کے علماء ان احکام شریعت کی حکمتیں نیز ان کے دنیوی فوائد اور برکات بیان کرتے رہے جو ہمیں معلوم ہیں، لیکن بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر فقہی اجتہادات میں معاونت وسہولت کے طور پر سو برسوں میں مقاصد شریعت کی طرف زیادہ توجہ رہی۔ چنانچہ تیونس میں ۱۹۶۶ء میں محمد طاہر بن العاشور (۱۸۷۹۔ ۱۹۷۳ء) نے اس موضوع پر ایک کتاب شائع کیا۔ ایک جگہ قرآن کریم کی ان آیات کا حوالہ دیتے ہوئے جن میں فساد کی مذمت کی گئی ہے اور زمین کو فساد سے پاک رکھنے کی تاکید کی گئی ہے، ابن عاشور لکھتے ہیں کہ "شریعت اسلامی کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ قانون بنانے کا عمومی مقصد نظام عالم کو برقرار رکھنا اور اسے اچھا بنائے رکھنا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو اس پر حاوی ہے، یعنی بنی نوع انسان، ان کو ٹھیک رکھا جائے، کیوں کہ اس کی درستی کا انحصار ان کی عقل، عمل، اور ان کے گرد پھیلی موجودات کی درستی پر ہے" (محمد الطاہر بن العاشور: مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ/ ۶۳، تیونس ۱۳۶۶ھ)۔ انہوں نے روایتی فہرست کی مزید تفصیل میں جانے کی کوشش بھی کی ہے، لکھتے ہیں: "اموال کی بابت شریعت کا مقصود پانچ چیزوں سے عبارت ہے، ایک یہ کہ اموال گردش میں رہیں، واضح رہیں، محفوظ رہیں (کہ کون سامال کس کا ہے)، عدل برقرار رہے (ان کے لین دین میں) اور (حقوق ملکیت) مستحکم ہوں" (محمد الطاہر بن العاشور: مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ/ ۱۸۸، تیونس ۱۳۶۶ھ، نیز ملاحظہ ہو)۔

ایک کتاب ڈاکٹر سعید رمضان بوطی کی "ضوابط المصلحۃ فی الشریعۃ الاسلامیہ" ہے، بہت ہی عمدہ کتاب ہے، اور بہت ہی تفصیلی کتاب ہے، اس میں انہوں نے مصالح کی قسمیں،

مقاصد کے درجات اور تعارض کی صورت میں ترجیح کے اصول بہت ہی وضاحت اور تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ ڈاکٹر مصطفی زید نے بھی طوفی اور مصلحت کے عنوان پر ''المصلحۃ عند الطوفی'' ''نجم الدین الطوفی'' جو اس مسئلہ میں متنازع شخصیت ہیں، ان کے نظریات اور ان کے بارے میں مزید تفصیلات انہوں نے پیش کی ہیں، اور بھی کئی کتابیں اس موضوع پر آئی ہیں، بلکہ ''المعہد العالمی للفکر الاسلامی'' نے تو مقاصد شریعت کو موضوع بنا کر درجنوں کتابیں اپنے یہاں سے شائع کی ہیں، ان کی کاوش تو یہ ہے کہ یہ اصول فقہ کا ایک حصہ اور جز نہ رہے بلکہ مستقل فن بن جائے، لہذا اس کے دائرے کو انہوں نے کافی وسیع کیا ہے، چنانچہ اب وہ حضرات اس دائرے کے اندر محض احکام عملیہ ہی نہیں، پوری شریعت کو لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

غرض یہ کہ انیسویں اور خاص کر بیسویں صدی میں مسلمان اہل علم نے فہم شریعت کے سلسلہ میں مقاصد شریعت میں غیر معمولی دلچسپی لی، جس کے نتیجے میں اس موضوع پر وسیع لٹریچر سامنے آیا ہے۔ اس سلسلہ میں امام شاطبی کی تصانیف پر بھی خصوصی توجہ کی گئی، بطور مثال درج ذیل کتابیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں:

- **نظرية المقاصد عند الامام الشاطبی، المعهد العالمی للفكر الاسلامی، الموسسه، ۱۹۹۲ء، ڈاکٹر احمد الریسونی**
- **مقاصد الشريعة الإسلامية وعلاقتها بالأدلة الشرعية للدكتور محمد سعد بن احمد الیوبی**
- **مقاصد الشريعة لطه جابر العلوانی**
- **مدخل إلى مقاصد الشريعة للدكتور احمد الريسونی**
- **علم المقاصد الشريعة للدكتور نور الدين بن مختار الخادمی**
- **علم مقاصد الشارع للدكتور عبد العزيز بن عبد الرحمن**
- **دراسة فی فقه مقاصد الشريعة بين المقاصد الكلية والنصوص الجزئيه للدكتور يوسف القرضاوی**

- مقاصد الشريعة الإسلامية تأصيلاً وتفعيلاً للدكتور محمد بكر إسماعيل جيب
- نحو تفعيل مقاصد الشريعة للدكتور جمال الدين عطية
- المقاصد العامة للشريعة الإسلامية لعبد الرحمن عبد الخالق
- قواعد المقاصد عند الإمام الشاطبی، المعهد العالمی للفكر الاسلامی ودار الفكر، ۲۰۰۰ء عبد الرحمن الكيلانی
- مقاصد الشريعة عند الشاطبی، عبد اللطيف محمد عامر
- نظرية المصلحة فی الفقه الإسلامی للشيخ حسين حامد حسان
- المقاصد العامة للشريعة الإسلامية للدكتور يوسف العالم
- نظرية المقاصد عند الإمام محمد الطاهر بن عاشور للدكتور اسماعيل حسنی
- الشاطبی ومقاصد الشريعة للحمادی العبيدی
- المقاصد وعلاقتها بالأدلة الشرعية للشيخ محمد سعد اليوبی
- مقاصد الشريعة الإسلامية ومكارمها للدكتور علال الفاسی
- ضوابط المصلحة فی الشريعة الإسلامية للشيخ محمد سعيد رمضان البوطی
- المختصر الوجيز فی مقاصد الشريعة للشيخ عوض بن محمد القرنی
- مقاصد الشريعة الإسلامية للدكتور محمد سليم العوا
- نحو تفعيل مقاصد الشريعة للدكتور جمال الدين عطية
- مقاصد الشريعة الإسلامية تأصيلاً وتفعيلاً للدكتور بكر اسماعيل
- حجة الله البالغة للإمام الشاه ولی الله المحدث الدهلوی
- مقاصد الشريعة للدكتور طه جابر العلوانی
- فقه المقاصد للدكتور جاسر عوده

اسی طرح معروف مصری عالم ڈاکٹر محمد کمال الدین الامام نے تین ضخیم جلدوں میں

''الدليل الإرشادی إلی مقاصد الشريعة الإسلامية'' کے نام سے ایک مفید کتاب لکھی ہے، جس میں مصنف نے مقاصد الشریعہ پر لکھی گئی قدیم وجدید کتب کا مفصل تعارف پیش کیا، جس کا اردو ترجمہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی طرف سے شائع ہو چکا ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی نے بھی اس سلسلہ میں مقاصد الشریعہ کے حوالے سے قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں، اور تقریباً اوپر ذکر کردہ کتب کا اردو ترجمہ اکیڈمی کی طرف سے شائع ہو چکا ہے، ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی صاحب کی کتاب ''مقاصد شریعت'' بھی اس سلسلہ کی ایک اچھی کوشش ہے، مقاصد شریعت پر بحث وتحقیق کا یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔

احادیث معاملات

مقاصد شریعت کے پس منظر میں

تمہید:

مقاصد شریعت سے مراد وہ بنیادی مقاصد واہداف ہیں جو اسلامی شریعت کے جملہ احکام میں بالواسطہ یا بلا واسطہ پیش نظر رہتے ہیں، بلکہ شریعت اسلامیہ کی عمومی حکمت کے لئے مقاصد شریعہ کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ شریعت کے احکام میں جو مصلحتیں پنہاں اور جو حکمتیں پوشیدہ ہیں، ان کا مطالعہ مقاصد شریعت کے عنوان کے تحت کیا جاتا ہے۔

جمہور علماء ومتکلمین اور اکثر فقہاء اسلام کا یہ کہنا ہے کہ احکام شریعت کے پیچھے بہت سی مصلحتیں موجود ہیں اور وہ مصلحتیں انسان کی فلاح وبہبود، انسان کی کامیابی وکامرانی، انسان کی زندگی میں توازن، اعتدال کا حصول، انسان کی جان ومال کی حفاظت اور بہت سی دوسری حکمتوں کا حصول ہے۔ یہ وہ مصلحتیں ہیں جو احکام شریعت میں اللہ نے پیش نظر رکھی ہیں، خود قرآن مجید پر غور کرنے سے بعض احکام کی مصلحتیں اور حکمتیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں، قرآن مجید نے جابجا وہ مصلحتیں بیان کی ہیں جن کی نشاندہی شریعت کے عمومی نصوص سے ہوتی ہے، جیسے حضور اکرم ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا: "**وما أرسلناک إلا رحمة للعالمین**" (سورہ انبیاء:۱۰۷) (ہم نے آپ کو ساری کائنات کے لئے رحمت ہی بنا کر بھیجا ہے)۔

نماز کے بارے میں فرمایا گیا: "**إن الصلاة تنهى عن الفحشاء والمنكر**" (سورہ عنکبوت:۴۵) (بے شک نماز بے حیائی کی باتوں اور منکرات سے روکتی ہے)۔

اسی طرح روزہ کی فرضیت کے بارے میں فرمایا گیا: "**كتب عليكم الصيام كما**

كتب على الذين من قبلكم لعلكم تتقون" (سورہ بقرہ: ۱۸۳) (تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا ہے جس طرح کہ تم سے پہلے لوگوں پر تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ)۔

قصاص کی مشروعیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :"**ولكم في القصاص حياة يا أولى الألباب لعلكم تتقون**" (سورہ بقرہ:۱۷۹) (اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو، تا کہ تم تقوی اختیار کرو)۔

پیغمبروں کے بھیجے جانے کی حکمت کے طور پر ارشاد فرمایا :"**لئلا يكون للناس على الله حجة بعد الرسل**" (سورہ نساء:۱۶۵) (تا کہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے یہاں پیش کرنے کے لئے کوئی حجت باقی نہ رہے)۔ اللہ نے موت وحیات کی حکمت بیان فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا :"**ليبلوكم أيكم أحسن عملاً**" (سورہ ملک: ۲) (تا کہ اللہ تعالی تمھیں آزما کر دیکھے کہ کون اچھا عمل کرتا ہے)۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :"**وما خلقت الجن والإنس إلا ليعبدون**" (سورہ ذاریات:۵۶) (کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں)۔

اسی طرح عام دینی احکامات کے بارے میں فرمایا :"**ما يريد الله ليجعل عليكم من حرج ولكن يريد ليطهركم وليتم نعمته عليكم لعلكم تشكرون**" (سورہ مائدہ:۶) (اللہ یہ نہیں چاہتا کہ تم پر تنگی پیدا کرے، لیکن وہ چاہتا ہے کہ تمھیں پاک کرے اور تم پر اپنی نعمتوں کو مکمل کر دے تا کہ تم شکر گزار بنو)۔

غرض شریعت کے ایسے بہت سے احکام ہیں جن کی پشت پر یہ اور اس طرح کی بے شمار حکمتیں ہیں، جو قرآن میں واضح طور پر بیان ہوئی ہیں، جنھیں شرعی احکام میں ملحوظ رکھا گیا ہے، اور ان مصالح کی نشاندہی کی گئی ہے جن کا رو بہ عمل لانا ان احکام کا مقصود ہے۔

اسی طرح اگر ہم احادیث کا بھی سرسری جائزہ لیں تو وہاں بھی ہمیں ہر حکم کے پیچھے کوئی نہ کوئی حکمت چھپی ہوئی نظر آئے گی کہ برصغیر کے امیر المؤمنین فی الحدیث حضرت شاہ ولی اللہ

محدث دہلوی نے اپنی کتاب ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں احادیث میں بیان کردہ بہت سی حکمتوں کو بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر احادیث میں رسول اللہ ﷺ نے چھپن قسم کے کاروبار کی ممانعت فرمائی ہے، ان احادیث پر ایک ساتھ غور کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان سب میں کوئی نہ کوئی مصلحت کارفرما ہے۔

اسی طریقے سے وہ صحابۂ کرام جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں تربیت پائی، انہوں نے بھی جابجا شریعت کے احکام کی حکمتوں کو بیان کیا ہے، خود آپ ﷺ کا طرز عمل یہ تھا کہ آپ کبار صحابہ کرام کی خاص طور پر تربیت فرمایا کرتے تھے تاکہ وہ شریعت کے احکام کے استنباط واجتہاد میں شریعت کی حکمت، مصلحت اور علت سے رہنمائی حاصل کریں۔

صحابۂ کرام اور تابعین کی زندگی میں ایسی سیکڑوں مثالیں ملتی ہیں جن میں انہوں نے قیاس سے کام لیا، نئے معاملات کے بارے میں اجتہاد کیا، اجتہاد کے عمل میں انہوں نے احکام کی علت پر غور کیا، جو حکمت اور مصلحت شارع کے پیش نظر تھی اس کو دریافت کیا، جیسے حضرت عمرؓ کا مفتوحہ اراضی سے متعلق اجتہاد، یا اسی طرح گھوڑے کو بھی مال زکوۃ میں شامل کرنا، حالانکہ آپ ﷺ نے واضح طور پر گھوڑے کو زکوۃ سے مستثنی کیا تھا، اسی طرح قیمتی ''سلب'' کو اموال غنیمت کی طرح ''تخمیس'' میں شمار کرنا وغیرہ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابۂ کرام دن رات رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں اٹھتے بیٹھتے تھے، اس لئے شریعت کی مزاج شناسی میں کوئی بڑے سے بڑا شخص ان سے آگے نہیں بڑھ سکتا، کوئی بڑے سے بڑا فقیہ یا مجتہد صحابہ کرام کے مقام سے آگے نہیں جاسکتا، اسی لئے یہ بات متعدد علماء اسلام نے یہ بات لکھی ہے کہ جو چیز بعد والوں کو علم حصولی کے ذریعہ حاصل ہوئی وہ صحابہ کرام کو علم حضوری کے ذریعہ حاصل ہوئی۔

آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابۂ کرام کے طرز عمل سے بہت سی ایسی حکمتیں اور مصلحتیں سامنے آتی ہیں، جو شریعت کے احکام میں پوشیدہ ہیں، جن پر فقہاء اسلام نے غور کیا اور

علم مقاصد شریعت کو مرتب کرنے میں سیرت اور صحابۂ کرام کے طرزِ عمل سے رہنمائی حاصل کی، لیکن ایسا نہیں ہے کہ شریعت کے جتنے بھی احکام ہیں وہ سب کے سب کسی حکمت یا مقصد پر ہی مبنی ہوں (جیسا کہ بعض متقدمین اسلام کا ماننا ہے، بلکہ ان میں سے کچھ احکام محض تعبدی ہی ہیں، جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن پاک میں بہت سی آیات ایسی بھی ہیں جن میں صراحت کے ساتھ کسی حکمت یا مصلحت کو بیان نہیں کیا گیا، یہی حال بہت سی احادیث کا بھی ہے، لیکن ایسے احکام بہت تھوڑے ہیں، جن کی حکمت کو دریافت کرنا انسانی عقل کے بس سے باہر ہے، اسی لئے ایک مسلمان اس پر اس لئے عمل کرے گا کہ وہ شریعت کا حکم ہے، اس لئے نہیں کرے گا کہ اس سے اس کی مصلحت پوری ہوتی ہے، مصلحت تو ہر صورت میں پوری ہوجائے گی۔

اس تعلق سے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اپنی کتاب ''احکام اسلام عقل کی نظر میں'' کے مقدمے میں بڑی اچھی بات لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اصل مدار ثبوت احکامِ شرعیہ کا نصوص شرعیہ ہے، جن کے بعد ان کے امتثال اور قبول کرنے میں ان میں سے کسی مصلحت وحکمت کے معلوم ہونے کا انتظار کرنا بالیقین اللہ جل سبحانہ کے ساتھ بغاوت ہے، جس طرح دنیوی سلطنتوں کے قوانین کی وجوہ واسباب اگر کسی کو معلوم نہ ہوں، اور وہ اس معلوم نہ ہونے کے سبب ان قوانین کو نہ مانے اور یہ عذر کردے کہ بغیر وجہ معلوم ہوئے میں اس کو نہیں مان سکتا، تو کیا اس کے باغی ہونے میں کوئی عاقل شبہ کرسکتا ہے؟ تو کیا احکام شرعیہ کا مالک ان سلاطین دنیا سے بھی کم ہوگیا؟ غرض اس میں کوئی شک نہ رہا کہ اصل مدار ثبوت احکام شرعیہ فرعیہ کا نصوص شرعیہ ہے اور گو مدار ثبوت احکام کا ان پر نہ ہو جیسا کہ اوپر مذکور ہوا، لیکن اس میں یہ خاصیت ضرور ہے کہ بعض طبائع کے لئے ان کا معلوم ہوجانا احکام شرعیہ میں مزید اطمینان پیدا ہونے کے لئے ایک درجہ میں معین ضرور ہے'' (احکام اسلام عقل کی نظر میں/ ۱۳)۔

امام شاطبیؒ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مقاصد شریعت کا علم مجتہد ہونے کی اولین شرط

ہے، اسی طرح ابن عاشور نے بھی اپنی کتاب ''مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ'' میں مقاصد کے علم کو اجتہاد کی تمام قسموں کے لئے لازم قرار دیا ہے (مقاصد الشریعہ/ ۶۱۵)۔

اسی لئے علماء نے لکھا ہے کہ مقاصد شریعت کا جاننا ہر شخص کے لئے ضروری اور مفید ہے۔ جہاں تک تعلق ہے موجود دور میں عصری مسائل کا مقاصد شرعیہ کی روشنی میں جائزہ لینے اور ان کو حل کرنے کا، تو شرعی حکم کے ساتھ اگر اس کی مصلحت وحکمت بھی معلوم ہو تو آدمی کے یقین میں اضافہ اور ایمان میں تازگی پیدا ہوتی ہے، اور علم الیقین کے بعد حق الیقین کا درجہ حاصل ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مصلحت کے حصول ہی کو علماء نے شریعت کا اصل مطلوب اور اس کا ہدف قرار دیا ہے جس کو وجود میں لانے کے لئے شریعت وضع کی گئی ہے (محمد ہاشم کمالی/ ۸)۔ اسی وجہ سے علوم اسلامی کے اکثر ماہرین نے اسرار شریعت کو اپنا موضوع بنایا اور شرعی احکام کی حکمتیں بیان کیں۔

خاص طور پر علماء اصول فقہ نے اپنی تصنیفات میں کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً ان حکمتوں پر بحث کی ہے، مثلاً: عزالدین عبد السلام نے ''قواعد الاحکام فی مصالح الانام'' میں، شیخ محمد طاہر العاشور نے ''مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ'' میں، ڈاکٹر محمد سعید البوطی نے ''ضوابط فی الشریعۃ الاسلامیہ'' میں، شیخ محمد ابوزہرہ نے ''فلسفۃ العقوبۃ فی الفقہ الاسلامی'' میں، محمد مصطفی الشبلی نے ''تعلیل الاحکام'' میں، شیخ محمد انیس عبادہ نے ''مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ'' میں، یوسف حامد العالم نے ''مقاصد الشریعہ'' میں، علال الفاسی نے ''مقاصد الشریعۃ ومکارمھا'' میں، امام غزالیؒ نے ''احیاء علوم الدین'' میں، ابن قیمؒ نے ''اعلام الموقعین'' میں، صبحی محمصانی نے ''فلسفۃ التشریع فی الاسلام'' میں، مصطفی زید نے ''المصلحۃ فی التشریع الاسلامی'' میں، ابو القاسم راغب الحسینی الاصفہانیؒ نے ''الذریعۃ إلی مکارم الشریعۃ'' میں، عفیف عبد الفتاح طیارہ نے ''روح الدین الاسلامی'' میں اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' میں اسرار شریعت ومقاصد شریعت کو موضوع بنایا ہے اور شرعی احکام کی حکمت سے روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔

باب اول:

مقاصد شریعت

مقاصد مقصد کی جمع ہے، اس کے معنی ہیں: وہ میانہ روی جو افراط وتفریط سے پاک ہو، قرآن کریم میں ہے: ''واقصد فی مشیک'' (لقمان:۱۹) (اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو)۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے: ''والقصد القصد تبلغوا'' (بخاری، کتاب الرقاق/ ۶۳ ۶۴) (میانہ روی سے دین پر چلتے رہو، منزل تک پہنچ جاؤ گے)۔

شریعت: عربی زبان میں پانی کے منبع اور سرچشمہ کو کہتے ہیں، نیز دین، ملت، طریقہ، سنت اور منہاج پر بھی شریعت کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

متقدمین اہل علم کے یہاں اس علم کا مستقل وجود نہیں ملتا ہے، لیکن عموماً تمام دینی علوم اور خصوصاً اصول فقہ کے ذیل میں اس علم وفن سے بحث کی جاتی تھی، چنانچہ مصلحت، حکمت، منفعت اور اسرار وغیرہ کی جو تعبیرات علوم دینیہ میں ملتی ہیں وہی مباحث اب مستقل موضوع اختیار کر کے ایک مستقل علم کی شکل اختیار کر گئے ہیں۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحبؒ کے مطابق ''مقاصد شریعت'' کی اصطلاح سب سے پہلے امام الحرمین جوینیؒ نے استعمال کی، اصول فقہ پر ان کی کتاب ''البرہان'' میں مقصد، مقاصد، قصد وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے گئے، مگر نئے اجتہاد کے آلہ کے طور پر مقاصد شریعت کا مؤثر استعمال ان کی دوسری کتاب الغیاثی میں پایا گیا ہے (مقاصد شریعت/ ۳)، امام جوینیؒ کے بعد ان کے شاگرد ابو حامد الغزالیؒ نے مقاصد شریعت کو باضابطہ ایک شکل دی، تاہم امام شاطبیؒ وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مقاصد شریعت کو اپنی کتاب الموافقات میں بہت شرح وبسط کے ساتھ

بیان کیا ہے، چنانچہ وہ اس تعلق سے لکھتے ہیں: ''سب سے پہلے اس بات کا جاننا ضروری ہے کہ جتنے بھی شرائع ہیں، ان سب کا مقصد انسان کے مصالح ہیں چاہے دنیاوی ہوں یا اخروی'' (الموافقات ۲/ ۱۳)۔

احمد الریسونی نے مقاصد شریعت کی تعریف میں لکھا ہے :

''إن مقاصد الشريعة هي الغايات التي وضعت الشريعة لأجل تحقيقها لمصلحة العباد'' (نظریۃ المقاصد عند الامام الشاطبی/ ۱۹۱) (مقاصد شریعت سے مراد وہ غایات ہیں جنہیں وجود میں لانے کے لئے شریعت مقرر کی گئی ہیں تا کہ مصلحت عباد کا حصول ممکن ہو سکے)۔

عصر حاضر میں اس موضوع پر ایک مفید ترین کتاب تحریر کرنے والے شیخ نور الدین الخادمی اس علم کی جامع ترین تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

''المقاصد هي المعاني الملحوظة في الأحكام الشرعية والمرتبة عليها سواء كانت تلك المعاني حكماً جزئية أم مصالح كلية أم سمات إجمالية وهي تجتمع ضمن هدف واحد، هو تقرير عبودية الله ومصلحة الإنسان في الدارين'' (الاجتہاد المقاصدی حجیتہ وضوابط مجالاتہ ۱/ ۵۲)۔

(مقاصد شریعت سے مراد وہ اہداف ہیں جو شرعی احکام میں ملحوظ رکھے گئے ہیں اور وہ بھی ہیں جو ان شرعی احکام پر مرتب ہوتے ہیں، چاہے وہ اہداف جزوی حکمتیں ہوں، کلی مصلحتیں ہوں یا محض اجمالی نشانیاں ہوں اور یہ سب اہداف اپنے ضمن میں ایک ہی ہدف رکھتے ہیں، اور وہ اللہ تعالی کی بندگی کا اظہار اور انسان کے لئے دنیا اور آخرت میں فائدہ مندی ہے)۔

ڈاکٹر یوسف احمد محمد البدوی اس تعریف پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وهذا تعريف موفق جداً لأنه انتبه إلى مقصد المقاصد وهو تقرير العبودية لله سبحانه تعالى ويتبعه مصالح العباد'' (یوسف احمد محمد: مقاصد الشریعۃ عند ابن تیمیہ/ ۵) (یہ تعریف اپنے مقصود کو بڑی کامیابی سے اجاگر کرتی ہے؛ کیوں کہ اس میں مقاصد شریعت کے مقصد کی جانب توجہ کی گئی ہے اور وہ ہے عبادت خداوندی کا اثبات، مصالح عباد اسی کے تابع ہے)۔

اورشریعت کی وضع وترتیب کا شرعی مقصد یہ ہے کہ مکلف کو اپنی خواہشات کی بندگی سے نکالا جائے، تا کہ جس طرح وہ اضطراری طور پر اللہ کا بندہ ہے، اسی طرح اختیاری طور پر بھی اس کا بندہ بن جائے'' (ابواسحاق شاطبی)۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب مرحوم لکھتے ہیں:

''شریعت کی اصل توجہ انسان کو فرائض کی تعلیم دینے کی طرف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مقام عبودیت اور منصب خلافت کی وجہ سے بنایا گیا ہے، شریعت کا اولین کام یہ ہے کہ لوگوں کو وہ طور طریق اختیار کرنے پر آمادہ کرے جو اس کے نزدیک تزکیہ کا باعث بن سکیں، لیکن ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے اور زندگی گزارنے کے یہ پاکیزہ طریقے اختیار کرنے کے لئے انسان کو ذرائع ووسائل، بعض مخصوص حالات اور ایک گونہ اختیار وآزادی کی ضرورت پڑتی ہے، ان کی فراہمی کے بغیر انسان سے ان فرائض کی بجا آوری کی توقع نہیں کی جاسکتی، چنانچہ شریعت کا ایک اہم کام ان ذرائع ووسائل کی فراہمی، مطلوبہ حالات پیدا کرنے کا اہتمام، اور انسانوں کو اپنی فطری قوتوں اور صلاحیتوں سے کام لینے کی وہ آزادی واختیار عطا فرمانا جو اس مقصد کے لئے ضروری ہے، یہی اصول شریعت اسلامی میں حقوق کا منبع ہے'' (نظریہ ملکیت/۸۰)۔

شریعت کے تمام ہدایات وضوابط متعدی واقع ہوتے ہیں، شارع جل سبحانہ کو ان کے ذریعہ خود اپنے اغراض کی تکمیل یا مفادات کا تحفظ مقصود نہیں بلکہ انسانوں کے مفادات ومصالح مقصود ہیں، ان مصالح ومفادات کا تعلق دنیا وآخرت دونوں سے ہے، دنیا کا حقیقی مفاد آخرت کے مفاد سے ہم آہنگ ہے، شریعت کے مقصود کو جامع طور پر انسان کے تزکیہ سے تعبیر کیا گیا ہے؛ کیونکہ یہی انبیاء کی بعثت کا بھی مقصد رہا ہے، جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا سے ظاہر ہے: ''**ربنا وابعث فیھم رسولا منھم یتلو علیھم آیاتک ویعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم**'' (البقرہ: ۱۲۹) (اے ہمارے پروردگار! ان کے درمیان انہی میں سے

ایک پیغمبر مبعوث فرما جوان کو تیری آیات سنائے، کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے)۔

تزکیہ کے پہلو بہ پہلو شریعت کا مقصد یہ بھی ہے کہ انسانی زندگی قائم رہے، خوش اسلوبی اور سہولت کے ساتھ زندگی گزاری جاسکے، اور دنیا میں اسے ایسی فلاح نصیب ہو جو فلاح آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکے۔

لیکن منصوص شرعی احکام کو ابدی قرار دینے سے اس بات کی نفی لازم نہیں آتی کہ اس کے پس منظر میں مخصوص مقاصد اور مصالح کارفرما ہوں اور انسان کو ان سے رہنمائی لینے کی ضرورت پیش آئے، ان دونوں باتوں کا اپنا اپنا محل ہے اور اپنے اپنے محل میں یہ بالکل درست ہیں، چنانچہ اللہ کی نسبت سے تو یہ بات کہنا بالکل درست ہے کہ وہ شریعت کے احکام اپنے پیش نظر مخصوص مقاصد ہی کے تحت دیتے ہیں، لیکن جہاں تک انسان سے مطلوب اتباع واطاعت کا تعلق ہے، تو اس دائرے میں درست ترتیب یہ بنتی ہے کہ مقاصد کی روشنی میں منصوص قوانین واحکام کا تعین بھی ازسرنو کیا جائے، نزول احکام کی بنیاد جلب منفعت اور دفع مضرت پر رکھی گئی ہے کیوں کہ شریعت کی نگاہ میں انسان کی منفعت اس کے دین، جان، نسل، عقل اور مال کے تحفظ میں مضمر ہے، اس کو فقہ اسلامی کی اصطلاح میں عموماً مصالح خمسہ اور مقاصد شریعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

''یہ بات طے شدہ ہے کہ شریعت کے وسیع ذخیرہ احکام میں کوئی حکم ایسا نہیں ہے کہ جو انسانی مصالح کی خاطر نہ ہو، اسی طرح یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ کوئی انسانی مصلحت ایسی نہیں ہے جس کے لئے شریعت میں کوئی حکم نہ دیا گیا ہو، شریعت اسلامی کے احکام کی چھان بین سے یہ دونوں حقیقتیں ثابت ہو چکی ہیں، یہاں یہ ضرور واضح رہنا چاہئے کہ انسان کے لئے کون سی چیز صالح ہے، اور کون صالح نہیں بلکہ ضرر رساں ہے، ان کو طے کرنے کا معیار خود انسان کی پسند نہیں بلکہ اللہ کی پسند ہے'' (فقہ اسلامی تعارف وتاریخ/ ۱۶۵)۔

امام غزالی مصلحت کی توضیح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''أما المصلحة فهی عبارة فی الأصل عن جلب المنفعة أو دفع المضرة، ولسنا نعنی به ذلک، فإن جلب المنفعة ودفع المضرة مقاصد الخلق، وصلاح الخلق فی تحصیل مقاصدهم، لکنا نعنی بالمصلحة المحافظة علی مقصود الشرع، ومقصود الشرع من الخلق خمسة: وهو أن یحفظ علیهم دینهم، ونفسهم، وعقلهم، ونسلهم، ومالهم، فکل مایتضمن حفظ هذه الأصول الخمسة فهو مصلحة، وکل ما یفوت هذه الأصول فهو مفسدة ودفعها مصلحة'' (المستصفی ۱/۱۰۲)۔

(مصلحت سے فی الاصل حصول منفعت اور دفع مضرت مراد ہوا کرتی ہے، مگر شریعت میں یہ مطلب نہیں، کیوں کہ حصول منفعت اور دفع مضرت مخلوق کے مقاصد ہیں، اور مخلوق کی صلاح ان مقاصد کی تحسین سے وابستہ ہے، البتہ مصلحت سے ہماری مراد مقاصد شریعت کی حفاظت ہے، اور باعتبار مخلوقات مقاصد شریعت پانچ ہیں: تحفظ دین، تحفظ نفس، تحفظ عقل، تحفظ نسل اور تحفظ مال، پس جو امر ان امور پنجگانہ کے تحفظ کا ضامن ہو وہ مصلحت ہے، اور جس بات سے یہ امور خمسہ ضائع ہوجائیں وہ ''مفسدہ'' ہے، اور اس کا دور کرنا مصلحت ہے)۔

معلوم ہوا کہ عربی زبان اور عرف کے اعتبار سے مصلحت کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ انسان کے مفاد کو ملحوظ رکھا جائے اور اس کو پہنچنے والی مضرت کو دور کرنے کی تدبیر اپنائی جائے۔

مقاصد شریعت کی اہمیت کے تعلق سے ڈاکٹر علی جمعہ لکھتے ہیں:

''یہ مقاصد اگرچہ شریعت کی معتبر مصلحت کی نمائندگی کرتے ہیں، لیکن ان کی اپنی اہمیت ومقصدیت ہے، اور یہ مسلمانوں کے فقہی اور تشریعی ذہن پر حاوی ہیں، ان ہی کے ذریعہ ان کے وجدان کی تشکیل ہوتی ہے بلکہ ان ہی کے ذریعہ عقل وذہن کو عیب ونقص سے پاک عمومی نظام کی حیثیت سے صحیح رخ ملتا ہے، اور یہی مقاصد مسلمان کے ہر عمل اور اس کی فہم شریعت کی حد بندی میں مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں'' (مقدمہ مقاصد شریعت عصری تناظر میں ۱/۸)۔

خلاصہ یہ نکلا کہ شریعت اپنے ان مصالح کی تکمیل دو طریقے سے کرتی ہے: ایک طرف تو شریعت زندگی بسر کرنے کے پاکیزہ طریقے متعین کرکے انسان کا تزکیہ کرتی ہے، وہیں

دوسری طرف انسان کے بنیادی مصالح ومفادات کا تحفظ عمل میں لاتی ہے۔

اپنے اس کام کو شریعت ناقابل عمل، یا دشوار احکام اور کٹھن پابندیوں کے ذریعہ نہیں بلکہ سہل اور قابل عمل ہدایات کے ذریعہ انجام دیتی ہے، انسانوں کو احکام شریعت کا پابند بنانے سے اللہ کا یہ مقصد نہیں کہ وہ ان سے بلاوجہ مشقت کرائے، بلکہ ان احکام میں انسان کی قوت برداشت کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

ارشاد ربانی ہے :''**وما جعل علیکم فی الدین من حرج**'' (الحج:۷۸) (اللہ نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی روا نہیں رکھا ہے)۔

''**یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر**'' (البقرہ: ۱۸۰) (اللہ تمہارے لئے آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے، تمھیں دشواریوں میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا)۔

اسی طرح نبی ﷺ سے مروی ہے :''**عن أبی ھریرۃ عن النبی ﷺ قال :إن الدین یسر**'' (بخاری، کتاب الایمان، باب الدین یسر/ ۳۹) (حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: دین آسان ہے)۔

سہولتِ دین اور قلت تکلیف سے مراد یہ ہے کہ احکام الٰہی میں تکلیف کم سے کم دی گئی ہے، سہولت اور آسانی زیادہ سے زیادہ رکھی گئی ہے، کیونکہ تکلیف کی کثرت سے بہت ساری تنگیاں اور دشواریاں پیدا ہوجاتی ہیں، جن کی وجہ سے انسان حدود وقوانین سے راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے، شیخ ابن العربیؒ ''قلت تکلیف'' کے بارے میں لکھتے ہیں:

''**ھذا أصل عظیم فی الدین، ورکن من أرکان شریعۃ المسلمین، شرفنا اللہ سبحانہ وتعالی علی الأمم بھا، فلم یحملنا إصراً ولا کلفنا فی مشقۃ أمراً**'' (احکام القرآن لابن العربی/ ۲۶۴)۔

(یہ دین کا ایک بڑا اصول اور مسلمانوں کے ارکان شریعہ میں سے ایک اہم رکن ہے، جس کی وجہ سے ہمیں اللہ تعالی نے دوسری امتوں پر عزت وشرف بخشا ہے کہ اس نے ہم سے کوئی سخت معاملہ بوجھ نہیں اٹھوایا اور نہ ہی مشقت والے کام کا ہمیں مکلف بنایا ہے)۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے : "**لا یکلف الله نفساً إلا وسعها**" (البقرہ:۲۸۶) (اللہ تعالی ہر نفس کو اس کی وسعت کے مطابق ہی تکلیف دیتے ہیں)۔

ان تمام احکام سے شارع کا مقصد و مصلحت یہ ہے کہ احکام کی بجا آوری میں ہر فرد اپنی استطاعت اور بساط کے مطابق ہی مکلف قرار دیا گیا ہے، کسی بھی فرد پر اس کی طاقت وقوت سے زیادہ بوجھ اور ذمہ داری نہیں ڈالی گئی ہے، جب کوئی کام انسان کی قدرت اور ہمت میں نہیں رہتا تو وہ اس کا مکلف بھی نہیں ٹھہرتا، اللہ تعالی اپنے بندوں کی ضروریات، طبائع اور مشکلات کو خوب جانتا ہے، اس نے احکام میں اپنے بندوں کے لئے آسانی، سہولت، تخفیف، عدم حرج، قلت تکلیف اور گنجائش و تدریج کو نمایاں رکھا ہے، تا کہ اس کے بندے مشکلات، تنگیوں اور تکالیف سے محفوظ رہیں۔

یہی نہیں اگر ہم احادیث پر بھی نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ آپ ﷺ نے "یسر" کو کتنی اہمیت دی ہے، اور اس کا کتنا خیال رکھا ہے، آپ ﷺ اپنے صحابہ کرام کی بھی اس کے مطابق تربیت کرتے تھے، اور انہیں ہدایت فرماتے تھے، آپ ﷺ نے فرمایا: "**یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا**" (صحیح بخاری، کتاب العلم، باب ما کان النبی ﷺ یتخولہم بالموعظۃ/ ۶۹) (آسانی فراہم کرو، تنگی میں مبتلا نہ کرو اور خوشخبری دیا کرو، تنفر مت کیا کرو)۔

آپ ﷺ نے شریعت اسلامی کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا : "**بعثت بالحنيفية السمحة**" (مسند احمد ۱/۲۷۳) (مجھے حنیفیت اور آسانی سے متصف شریعت دے کر بھیجا گیا ہے)۔

اسی طرح حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں : "**إن الدين يسر ولن يشاد الدين أحد إلا غلبه**" (صحیح بخاری، کتاب الایمان/ ۳۹) (بے شک دین تو آسان ہے، اور جو شخص دین میں سختی کرے گا تو دین اس پر غالب آجائے گا)۔

حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں : "**ما خير رسول الله ﷺ بين أمرين إلا اختار أيسرهما ما لم يكن إثماً**" (صحیح بخاری، کتاب الادب: ۶۱۲۶) (رسول اللہ ﷺ کو جب بھی

دو کاموں میں اختیار دیا گیا، تو آپ نے ہمیشہ وہ پہلو منتخب کیا جو زیادہ آسان تھا بشرطیکہ اس میں گناہ نہ ہو)۔

اسی طرح آپ ﷺ کو مسواک بہت محبوب تھی، لیکن فرمایا: **"لو لا أن أشق علی أمتی لأمرتھم بالسواک مع کل صلاۃ"** (صحیح بخاری، کتاب الجمعہ ر ۸۸۷) (اگر میری امت پر یہ شاق نہ ہوتا تو میں انہیں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنے کا حکم دیتا)۔

حاصل یہ کہ اسلام کی تعلیمات آسانی اور رفع حرج پر مبنی ہیں، اور یہ پہلو اتنا اہم ہے کہ اسلام نے نیکی اور تقوی کے نام پر بھی خود کو بے جا مشقت میں مبتلا کرنے سے روکا ہے، خصوصاً معاملات میں آپ ﷺ نے یسر اور آسانی کا بہت خیال رکھا ہے، ایک حدیث میں ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: اللہ تعالی اس شخص پر رحم فرماتا ہے جو بیچتے، خریدتے اور تقاضا کرتے وقت آسانی کا رویہ اختیار کرتا ہے (بخاری، کتاب البیوع ر ۲۰۷۶)، مطلب یہ کہ نہ کوئی چیز بیچتے وقت جھک جھک کرتا ہے، نہ خریدتے وقت بک بک کا رویہ اپناتا ہے، اور نہ رقومات کے تقاضے میں لڑتا جھگڑتا ہے، اس کے برعکس نرمی اور آسانی اس کے مزاج کا حصہ ہوتی ہے۔

نرمی اور آسانی کا رویہ اختیار کرنا اور دوسرے انسانوں کے ساتھ معاملات میں سہولت پسند ہونا یہ اللہ کو بہت پسند ہے، اگر کسی شخص سے کوئی ایسا معاملہ ہو گیا جو اس کے مفاد یا مصلحت کے خلاف تھا اور بعد میں وہ شخص اس پر پچھتاتا ہے اور اس کو ختم کرنا چاہتا ہے، تو شریعت کی ہدایت یہ ہے کہ تم اس کو ختم کرنے میں مدد دو، جیسا کہ چند روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"اگر کوئی شخص کسی ایسے شخص کے معاملے کو ختم کرنے میں مدد دے، جو اپنے معاملے پر پچھتا رہا ہو تو اللہ تعالی روز قیامت اس کی بہت سی غلطیاں ختم فرما دیں گے" (ابوداؤد: ۳۴۶۰، مسلم: ۲۶۹۹، ترمذی: ۱۹۳۰ وغیرہ)، شرط یہ ہے کہ وہ تیسیر یعنی سہولت و آسانی مقاصد شریعت سے بھی آہنگ

ہونی چاہئے، یعنی اسلام جن مقاصد ومصالح کو وجود میں لانا چاہتا ہے، آسانی اور سہولت ان کے تحت ہونی چاہئے نہ کہ ان کے برخلاف، نیز وہ تیسیر نصوص سے بھی متصادم نہ ہو، یعنی ایسا نہ ہو کہ ایک کام جو بظاہر آسان سمجھ کر اختیار کیا جائے، وہ صریح نصوص سے ٹکراتا ہو، ایسی صورتحال میں اس کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ شریعت کے احکام پر عمل کرنا واجب ہوگا۔

عصر حاضر میں مسلمانوں کو درپیش مسائل کا اگر جائزہ لیا جائے، تو ان میں غیر مسلم اکثریتی ممالک میں مسلمانوں اور مسلم اکثریتی ممالک میں غیر مسلموں کے لئے، شہریت، حکومت اور فوج میں شرکت، اسلامی تمویل کے حوالہ سے نئے رجحانات اور جدید حیاتیاتی اخلاقیات وغیرہ جیسے مسائل سرفہرست ہیں، جن کا مقاصد شریعت کی روشنی میں حل تلاش کرنا ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر کے علماء نے اس کی اہمیت کو سمجھ کر بجا طور پر اس میں مفید اضافے بھی کئے ہیں۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی مرحوم اپنی کتاب ''مقاصد شریعت'' میں اس کی اہمیت کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''مقاصد شریعت، مصالح مرسلہ، اسرار شریعت، معانی وحکم جیسے الفاظ سے تعبیر کیا جانے والا یہ تصور شروع ہی سے موجود رہا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالی اپنے بندوں کو جو احکام دیتے ہیں، ان سے انسانوں کی ہی بھلائی مقصود ہے، اللہ بے نیاز ہے، اسے ہم انسانوں سے کچھ نہیں لینا، انسانوں کے اخروی اور دنیوی مفادات سامنے رکھ کر انہیں جو احکام دیئے گئے ہیں، ان میں سے بعض کے بارے میں قرآن وسنت میں بتا دیا گیا ہے کہ ان سے کیا فائدے ہوں گے، اور خاص کر دنیوی امور سے متعلق احکام میں بعض پر غور کرنے سے ان کے فائدے سمجھے جاسکتے ہیں۔ یہ بات کہ ان مصالح اور مقاصد کو سمجھ کر بیان کیا جائے جن کا شارع نے لحاظ رکھا ہے، دو وجہوں سے اہم ہے: اگر احکام شریعت کو موتیوں سے تعبیر کیا جائے تو مقاصد شریعت کا بیان ان موتیوں کو ایک لڑی میں پرو کر ہار بنا دیتا ہے، بالفاظ دیگر مقاصد شریعت کا بیان احکام شریعت کو ایک باہم مربوط اور واضح اہداف کے حامل نظام کے طور پر سمجھنا ممکن بنا دیتا ہے، مقاصد شریعت کا

دوسرا اور وقت کے ساتھ اہمیت والا فائدہ یہ ہے کہ وہ ان نئے مسائل کے معلوم کرنے میں مددگار ہوتے ہیں جن کے بارے میں کوئی حکم موجود نہ ہو'' (مقاصد شریعت/۲۱)۔

حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب بھی نئے دور میں مقاصد شریعت کی اہمیت اور نئے پیش آمدہ مسائل کا مقاصد شریعت کی روشنی میں حل تلاش کرنے پر زور دیتے ہوئے اپنے مقالہ ''مقاصد شریعت اور نئے مسائل'' کے ذیل میں متعدد نئے پیش آمدہ مسائل کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''میں ان مسائل کے بارے میں اپنی کوئی رائے نہیں دیتا، لیکن صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جو نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں، مقاصد شریعت کے پس منظر میں ان مسائل پر ہمیں غور کرنا ہوگا، اور اس کو سمجھنا ہوگا کہ بہت سے مسائل وہ ہیں جو مسلمان اقلیتوں سے متعلق ہیں، جہاں مسلمان اقلیت کی حیثیت سے رہتے ہیں، وہ بہت سے مواقع پر ایسی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں جس صورت حال سے عالم اسلام کے مسلمانوں کو دوچار نہیں ہونا پڑتا ہے، وہاں بھی مقاصد شریعت کا تحفظ ضروری ہے، ایجاباً اور سلباً دونوں پہلوؤں سے'' (مقاصد شریعت: تعارف اور تطبیق/۲۹۸)۔

مندرجہ بالا تحریر سے مقاصد شریعت کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، لہذا اب ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلم ممالک ہوں یا غیر مسلم ممالک، مسلمان اقلیت میں ہوں یا غیر اقلیت میں، وہاں کے نئے پیش آمدہ مسائل پر مسلمان علماء کی بھرپور توجہ اور بحث وتحقیق ہو، کیونکہ بہرحال یہ فریضہ بھی علماء کی ذمہ داری ہے۔

وہ مصالح جن کو بروئے کار لانا شریعت میں ملحوظ رکھا گیا ہے، یا وہ مقاصد جن کو شرعی احکام سے شارع نے پورا کرنا چاہا ہے، علماء اصول نے استقراء اور تتبع کے بعد ان کی تین قسمیں کی ہیں، یا ان کے تین مدارج متعین کئے ہیں:

۱۔ضروری مصالح۔

۲۔حاجیاتی مصالح۔

۳۔تحسینی مصالح۔

مصالح ضروریہ ان اہداف وغایات کو کہا جاتا ہے کہ اگر وہ ہاتھ نہ آئے تو انسان کی دنیا یا آخرت برباد ہوجائے ،یعنی جن پر انسان کی دینی اور دنیوی زندگی موقوف ہے، اور اس کے نہ ہونے سے نہ صرف یہ کہ دنیاوی زندگی متاثر ہوگی بلکہ آخرت کی زندگی بھی بگڑنے کا اندیشہ ہے، مثلاً نکاح اور نماز پڑھنا کہ اگر نکاح کی قدرت ہو اور کوئی مانع بھی نہ ہو، اور اس کے باوجود نکاح نہ کیا جائے تو دنیاوی فوائد و برکات سے محرومی ہے، اور اگر شرعی عذر نہ پائے جانے کے باوجود کسی نے نماز چھوڑ دیا تو اس نے آخرت کو بھی تباہ کیا، یہ مقاصد شرعیہ کی سب سے اہم قسم ہے، یہ ایسا ہے گویا کہ شریعت نے احکام شرعیہ میں ان مصالح کو علت کے بعد سب سے مقدم رکھا ہے، اور یہی وہ پانچ مصالح ہیں جنھیں مقاصد خمسہ بھی کہا جاتا ہے، یعنی ان پانچ چیزوں کی حفاظت شریعت کا مطمح نظر اور شرعی احکام کا مقصود ومدعا ہے، اور انہی پانچوں کلیات واصول کی حفاظت سے انسان کی دینی ودنیوی زندگی کی سلامتی بھی وابستہ ہے، ان کے مفقود ہونے کی صورت میں دنیا کے مصالح استوار نہیں رہ سکتے، بلکہ فساد وبدامنی اور انسانی زندگی کا ضیاع ہوگا اور آخرت میں نجات سے محرومی اور کھلا ہوا خسارہ ہوگا۔

یہ پانچ مقاصد درج ذیل ہیں:

۱۔دین کی حفاظت۔

۲۔انسانی جان کی حفاظت۔

۳۔انسانی عقل کی حفاظت۔

۴۔انسانی نسل کی حفاظت۔

۵۔انسان کے مال کی حفاظت۔

امام غزالیؒ نے المستصفی میں اور ابن الحاجبؒ، قرافیؒ اور شاطبیؒ نے مقاصد ضروریہ کی مثال میں دین، نفس، عقل، مال اور نسب کی حفاظت کو پیش کیا ہے، ابن عاشور نے لکھا ہے کہ آبرو کی حفاظت کو مقاصد ضروریہ میں شامل کرنا درست نہیں، بلکہ یہ مقاصد حاجیہ میں شمار ہونے

کے لائق ہے (اسلامی شریعت کا عمومی نظریہ/ ۱۵)۔

امام شاطبیؒ نے اپنی کتاب ''الموافقات'' میں ان پانچ مقاصد کے تعلق سے لکھا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

''یہ پانچ مقاصد ایسے ہیں کہ شریعت نے جتنے بھی احکام دیئے ہیں، ان سب میں ان پانچ مصلحتوں میں سے کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور موجود ہوگی، اور بعض میں دو یا تین یا سب مصلحتیں بھی موجود ہوسکتی ہیں، لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ شریعت کا کوئی حکم ایسا ہو کہ جس میں ان پانچ باتوں میں سے کوئی بھی بات موجود نہ ہو، ان پانچوں باتوں کی اصل اور بنیاد خود قرآن مجید ہے جو اس فن کے ماہرین اور ماہرینِ قرآن پر مخفی نہیں''۔

چنانچہ جاسر عودہ لکھتے ہیں:

''اگرچہ مذکورہ مقاصد میں حفاظت نفس اور حفاظت عقل جیسی کچھ چیزیں ایسی ہیں جو کہ ہر زمان ومکان کو عام ہیں، لیکن اس کے باوجود ہمارے نزدیک ''نظریہ مقاصد'' ایک ایسا نظریہ ہے جو کہ زمانہ اور حالات کی تبدیلی کے نتیجے میں تجدید کا محتاج ہوتا ہے، اس لئے مذکورہ بالا چھ مقاصد یا ان کے علاوہ کچھ اور مقاصد تک علماء کی رسائی نصوص کے استقراء کے ہی نتیجے میں ہوئی ہے، اور استقراء مجتہد کے ذہن میں نظریاتی تصور ہی کا نام ہے، جو زمان ومکان اور عقلوں کی تبدیلی سے بدل سکتا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ شارع حقیقی نے تشریع میں مقاصد کی کسی مخصوص ترتیب کا خیال نہیں رکھا'' (فقہ مقاصد: جاسر عودہ، ترجمہ: الیاس نعمانی ندوی/ ۲۶)۔

آگے لکھتے ہیں: ''جیسا کہ عامری نے ضروریات خمسہ کے ضمن میں ایک مقصد ''مؤجرة أخذ المال'' (ناحق مال ہتھیانے سے روک تھام) کا ذکر کیا ہے، جس کی وجہ سے چوری اور ڈکیتی کی حد مشروع کی گئی ہے، پھر امام الحرمینؒ نے اسی کو ''عصمة المال'' سے تعبیر کیا ہے، اور بعد میں اس کو امام غزالی نے مستصفی میں ''حفظ المال'' کی اصطلاح دی، امام شاطبیؒ نے الموافقات میں اس کے ماخذ بیان کئے ہیں'' (حوالہ سابق/ ۳)۔

شیخ یوسف القرضاوی نے بھی مقاصد کی فہرست میں توسیع کرتے ہوئے اس میں اجتماعی تکافل، آزادی، شرافت انسانی اور اخوت انسانی کا اضافہ کیا ہے، نیز انہوں نے ان سب کو شریعت کے بنیادی مقاصد کے ذیل میں ذکر کیا ہے (المدخل للقرضاوی/ ۷۵)۔

اسی طرح ڈاکٹر محمد ہاشم کمالی نے بھی اس فہرست میں اضافہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''میں مذکورہ بالا فہرست میں ان امور کا اضافہ کرتا ہوں: اقتصادی ترقی، ٹکنالوجی اور علوم کو ترقی دینا، اس لئے کہ امت اسلامی کو اقوام عالم میں صحیح مقام دلانے کے لئے یہ دونوں امور لازمی ہیں'' (مقاصد شریعت: آسان اور مختصر تعارف/ ۲۲)۔

اسی طرح ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی مرحوم نے بھی مقاصد خمسہ میں اضافہ کیا ہے اور پھر ان مقاصد کے معتبر اور مستند ہونے پر اپنی کتاب ''مقاصد شریعت'' میں دلیل بھی دی ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ ''روایتی فہرست میں سارا زور دفع مضرت پر ہے، جلب منفعت کا پہلو دب گیا ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ موجودہ عالمی اور قومی سطح کے مسائل میں ماحولیاتی تلوث پر کنٹرول، کائنات کے قدرتی وسائل کا بچاؤ، عمومی اور کلی تباہی مچانے والے اسلحوں کے استعمال اور ان کی پیداوار پر پابندی اور موجودہ نیوکلیائی ہتھیاروں، نیز کیمیائی اور حیاتیاتی اسلحوں کا تلف کیا جانا اور اقوام عالم کے باہم امن وچین سے رہ سکنے کے دوسرے تقاضے پورے کرنے کے لئے یہ بہتر ہے کہ ان امور سے مناسبت رکھنے والی اسلامی تعلیمات کو اہمیت کے ساتھ پیش کیا جائے، مسئلہ یہ نہیں کہ منطقی طور پر کیا بات کس بات سے نکالی جاسکتی ہے، اہم بات یہ ہے کہ نئے حالات میں اسلام اور مسلمانوں کو سیاسی، معاشی اور سماجی امور میں دنیاوی رہنمائی کے لئے کس طریقے سے زیادہ مدد مل سکتی ہے۔ ہمارے خیال میں گلوبلائزیشن کے چیلنجوں سے عہدہ برآ ہونے میں مقاصد شریعت کی فہرست میں ان چیزوں کے اضافے سے مدد ملے گی جن کی مقصودیت کو کتاب وسنت کی سند تو حاصل ہے، مگر اب سے پہلے ان کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ جن مقاصد کو ابھار کر پیش کرنا مناسب ہوگا وہ درج ذیل ہیں:

۱۔انسانی عزوشرف۔

۲۔بنیادی آزادیاں۔

۳۔عدل وانصاف۔

۴۔ازالۂ غربت اور کفالت عامہ۔

۵۔سماجی مساوات اور دولت وآمدنی کی تقسیم میں پائی جانے والی ناہمواری کو بڑھنے سے روکنا۔

۶۔امن وامان اور نظم ونسق۔

۷۔بین الاقوامی سطح پر باہم تعامل اور تعاون (حوالہ مقاصد شریعت/۲۰)۔

ان کے علاوہ اور بھی دیگر لوگوں نے اسی طرح کے ملتے جلتے دیگر مقاصد کا اضافہ کیا ہے، جیسے کہ مراکش کے علال الفاسی نے ''عدل وانصاف قائم کرنے''، ہر فرد کے لئے فکری آزادی اور نفسیاتی اطمینان وسکون کی ضمانت دینے کو مقاصد شریعت میں شمار کیا ہے (مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ ومکارمہا: الدار البیضاء/۷، ۱۹۸۳)۔ اسی طرح احمد الخلمیشی نے بھی عدل، انفرادی حقوق اور آزادی کو مقاصد شریعت میں شمار کیا ہے (وجہۃ نظر: الدار البیضاء/۱۹۸۸ بحوالہ احمد الریسونی/۳۵۸)۔

خلاصے کے طور پر ہم یہاں ڈاکٹر جاسر عودہ کی عبارت کا ترجمہ اور مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی عبارت نقل کرنا مناسب سمجھیں گے، ڈاکٹر جاسر عودہ لکھتے ہیں:

''معاصر علماء کے یہ قیمتی اضافے ابھی مزید بحث وتنقیح کے محتاج ہیں، تاکہ نصوص شرعیہ سے ان کا ربط واضح کیا جاسکے اور پھر مقاصد کی اصطلاح کی نئی تشریح وتوضیح کی جائے''، آگے لکھتے ہیں: ''مقاصد کی اصطلاح میں پائی جانے والی لچک ہمارے لئے یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ ہم انسانی وسائل کی ترقی کے لئے مقاصد شریعت میں ایک ''مقصد'' کا اضافہ کریں جو کہ اس کے موجودہ رائج مفہوم کے مقابلے میں ایک امتیازی مفہوم رکھتا ہو'' (حوالہ فقہ مقاصد/۲۹)۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں:

''مقاصد کی یہ پانچ قسمیں علی سبیل الحصر نہیں ہیں، بلکہ بطور استقراء یہ قسمیں کی گئی ہیں: حفظ دین، حفظ نفس، حفظ نسل، حفظ مال اور حفظ عقل، یہی اس کی ترتیب بھی ہے۔ دوسرے حضرات چاہیں تو اس کی نئی قسم بھی کر سکتے ہیں یا اس کے مفہوم کے دائرے کو وسیع کر سکتے ہیں، پھر ان مقاصد کے جو مدارج ہیں، امام غزالی نے اس کے تین درجے کئے ہیں: ضرورت، حاجت، اور تحسین۔ بعض لوگوں نے پانچ درجے بھی کئے ہیں، قطعی طور پر یاد نہیں ہے؛ لیکن غالباً عزالدین بن عبدالسلام کے یہاں پانچ درجے ملتے ہیں، علامہ شاطبی نے ہر درجے کے ساتھ ایک مکملات بھی رکھا ہے، ضرورت، مکمل ضرورت، حاجت، مکمل حاجت، تحسین، مکمل تحسین۔ اس طرح درجات بڑھ جاتے ہیں، لیکن اصل بنیاد انہی تینوں پر ہے: ضرورت، حاجت اور تحسین، اور ترتیب بھی یہی ہے تا کہ بحیثیت مقاصد سب سے زیادہ ترجیح ہوگی ''حفظ دین'' کو، چاہے اس سے ضیاع نفس ہو جائے، اسی لئے جہاد کی اجازت دی گئی، پھر ''حفظ نفس'' کو، چاہے اس کے لئے ضیاع مال ہو جائے، پھر ''حفظ نسل'' کو، چونکہ اس سے انسانی عزت وآبرو کا تحفظ متعلق ہے، پھر ''حفظ مال'' کو، پھر ''حفظ عقل'' کو، اور احکام کے مدارج میں ترجیح دی جائے گی ضرورت کو، پھر حاجت کو، پھر تحسین کو، اگر ایک مقصد کی ضرورت کا ٹکراؤ دوسرے مقصد کی حاجت سے ہو جائے تو ضرورت کو ترجیح دی جائے گی'' (مقاصد شریعت: تعارف وتطبیق/ ۳۰۲)۔

تحفظ دین:

ان مقاصد میں سے سب سے پہلا مقصد تحفظ دین ہے، دین سے مراد یہ ہے کہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان جو خاص رشتہ ہے، اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کی جو نوعیت ہے، جس کی تحدید قرآن پاک اور سنت سے ہوتی ہے اور جس کو منظم کرنے کے لئے قرآن پاک اور احادیث میں بے شمار احکام دیئے گئے ہیں، جیسے نماز کا حکم، روزہ کا حکم، تلاوت کا حکم،

اللہ کو یاد رکھنے کا حکم اور ذکر کا حکم، ان تمام چیزوں کا مقصد یہ ہے کہ اللہ اور بندے کے درمیان تعلق استوار رہے، اور اللہ کے حضور جواب دہی کا احساس بندے کے دل میں بیدار رہے، یعنی اللہ تعالی نے انسان کی صلاح وفلاح ہی کے لئے دین نازل کیا پھر انسان کی قوت نظری وعملی دونوں کی تکمیل کے لئے صحیح عقیدہ اور عبادت کی تلقین کی، اور یہ بات فرض کی کہ آدمی سچے دین سے وابستہ رہے، اور اسی دین کی حفاظت کی خاطر جہاد فرض کیا، غلط افکار وعقائد کی ترویج کی ممانعت کی، ارتداد کی سزا متعین کی، اور دین حق سے پھر جانے پر عقوبت رکھی، یہ شریعت کے احکام کا سب سے پہلا مقصد ہے؛ اس لئے جب ہم قرآن واحادیث اور فقہ وسنت کے ذخیروں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم پاتے ہیں کہ اس مقصد کے حصول کی خاطر ہزاروں کی تعداد میں بالواسطہ یا بلاواسطہ احکام موجود ہیں۔

مطلب یہ کہ دین ایک مکمل اور جامع نظام حیات کا نام ہے، جسے ہمیں زندگی کے تمام شعبہائے زندگی میں سامنے رکھنا ہے، جیسا کہ ''یوسف حامد العالم'' نے اپنی کتاب ''المقاصد العامۃ للشریعۃ الاسلامیۃ'' میں لکھا ہے : ''مصنف کے نزدیک کامل دین جو اللہ کے نزدیک قابل قبول ہے، وہ ہے جو ایمان اور عمل دونوں کا جامع ہو، ٹھیک جس طرح درخت جڑ اور تنے کا جامع ہوتا ہے، زمین میں پوشیدہ جڑ ایمان ہے، اور ظاہر میں شاخیں اور تنے اعمال ہیں، اگر تنے شاداب ہوں تبھی سمجھا جائے گا کہ جڑ پیوست اور مضبوط ہے، اور جب جڑ پیوست ہوگی تبھی تنے میں شادابی آئے گی، پس ایمان وہ اصل ہے جس پر تمام اعمال کی بنیاد ہے، ایمان کے بغیر اسلام قابل قبول نہیں ہے (مقاصد شریعت: تعارف وتطبیق/۴۳۰)۔

تحفظ جان :

شریعت کی اصطلاح میں ہر انسان معصوم الدم ہے، اس کا خون محفوظ ہے، ایک انسان کی جان لینا پوری انسانیت کی جان لینے کے برابر ہے، اور ایک انسان کی جان بچانا پوری انسانیت کی جان بچانے کے مترادف ہے، انسانی جان کی بہت اہمیت ہے، لہذا ہم دیکھتے

ہیں کہ شریعت کے بہت سے احکام انسانی جان کے تحفظ کے لئے مشروع کئے گئے ہیں، جیسے انسانی جان کو پیش آنے والے خطرات سے باز رہنے کی تلقین کی گئی ہے، خودکشی کو حرام قرار دیا ہے، قتل نفس کی سزا مقرر کی ہے، قصاص، دیت اور کفارہ وغیرہ جیسی سزائیں متعین کی گئی ہیں، تا کہ انسانی جان کی حفاظت کی جا سکے۔

خلاصہ یہ کہ شریعت کے بے شمار احکام انسانی جان کی عزت و کرامت اور انسان کے اس مرتبہ کے تحفظ کے لئے دیئے گئے ہیں جس پر اللہ نے انسان کو فائز کیا ہے۔

تحفظ عقل:

انسان کو اللہ نے زمین پر اپنا جانشیں اور خلیفہ مقرر کیا ہے، لہذا انسان اللہ کے احکام کا پابند اور مکلف بھی ہے، اور ان سب ذمہ داریوں کی انجام دہی عقل پر موقوف ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان کا شرف امتیاز یعنی جو چیز اس کو محترم و ممیز بناتی ہے، اور اس کو شرعی ذمہ داریوں کا مکلف کرتی ہے وہ انسان کی عقل ہے، اس لئے عقل کا تحفظ شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے، لہذا ہر وہ حرکت و عمل جس سے انسان کی عقل محفوظ نہ رہے، جیسے منشیات، شراب اور نشہ وغیرہ، ان سب کو عقل انسانی کی حفاظت کی خاطر شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے، نیز اس کے لئے حدود اور سزائیں متعین کی ہیں۔ ضروریات خمسہ میں ترتیب کے لحاظ سے عقل کا تیسرا درجہ اسی لئے ہے کہ دین پر اسی وقت صحیح طریقے سے عمل ہو سکتا ہے، جب انسان کی جان و نفس امن وسکون حفاظت سے ہو، بلکہ انسان مکلف ہی اس وقت بنتا ہے جب وہ خطاب شرعی کو سمجھ سکتا ہو، لہذا اس کے لئے عقل کی حفاظت لازم ٹھہرائی گئی اور اسی وجہ سے شراب اور نشہ آور چیزوں کو حرام ٹھہرایا گیا۔

تحفظ نسل:

شریعت نے نسل کی حفاظت کو بھی بہت اہمیت دی ہے، اسی نسل کی حفاظت کے

لئے حدزنا اور حدقذف کا حکم نازل فرمایا، اسی کی خاطر ضبط ولادت اور انسانوں کو زندہ درگور کرنے کو حرام قرار دیا، وہیں دوسری جانب نکاح کو سنت اور ضروری قرار دیا اور اس نکاح کی حرمت کو پامال کرنے والوں کے لئے زنا کی سزا مقرر کی تا کہ نسل انسانی محفوظ رہے۔

چونکہ اسلام ایک ایسے پاک وصاف معاشرہ کے قیام کا خواہاں ہے جس میں تمام لوگ پاکیزہ زندگی گزاریں، ہر ایک کو اپنا نسب معلوم ہو؛ کیوں کہ وہی معاشرہ پر امن اور پُرسکون رہ سکتا ہے کہ جس میں اخلاقی اقدار کی پاسداری ہو، یہی وجہ ہے کہ شریعت نے نہ صرف زنا کو حرام ٹھہرایا بلکہ مبادیٔ زنا (زنا کرنے پر ابھارنے والی چیزوں) سے بھی بچنے کی تلقین کی۔

تحفظ مال:

یہ شریعت کا پانچواں مقصد ہے، جس کا بنیادی مقصد انسان کی جائیداد اور مال کا تحفظ ہے، خواہ وہ جائیداد فرد کی ہو یا افراد کی، گروہوں کی ہو یا حکومتوں کی، ریاستوں کی ملکیت ہو یا کسی اور ادارے کی، ان سب کا تحفظ شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے، جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک حدیث میں مال کو ضائع کرنے سے منع فرمایا ہے (صحیح مسلم ۱/ ۵۹۳، کتاب الاقضیہ)۔ مال چاہے کسی کی ملکیت ہو یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں مال کو ضائع اور تلف کرنا ممنوع ہے، اس لئے کہ مال بھی اللہ تعالی کی ایک عظیم نعمت ہے، انسان کی زندگی کا قیام ونظام اسی سے وابستہ ہے، اسی لئے اللہ تعالی نے ایک طرف مال کمانے کی اجازت دی، اس کے لئے جدوجہد اور سعی کا حکم دیا تو دوسری طرف بیع وشراء، اجارہ، سلم واستصناع وغیرہ کو مشروع قرار دیا؛ تا کہ مال کی حفاظت کا کام صحیح طریقے سے انجام دی جا سکے۔

مال کے تعلق سے ''یوسف حامد العالم'' نے بڑی اچھی گفتگو کی ہے، جس کا خلاصہ ''مولانا فہیم اختر ندوی'' نے کیا ہے، میں ہو بہو اس خلاصے کو یہاں ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ یوسف حامد العالم نے مال کے تعلق سے شریعت کے چار مقاصد بیان کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

۱۔ ''اول یہ کہ مال جائز طریقے سے گردش میں رہے، اس کے لئے اسلام کرنسی کو منجمد

کرنے سے روکتا ہے کیوں کہ یہ ذریعہ تبادلہ ہے، ربا اور سود کو اسلام حرام قرار دیتا ہے اس لئے کہ یہ صریح ظلم ہے، سود انسان کے اندر سے شفقت وہمدردی کے جذبات کو فنا کر دیتا ہے، اور امیر وغریب کے درمیان خلیج کو وسیع کر کے دونوں کے درمیان نفرت کو جنم دیتا ہے، سود کے نقصانات اخلاقی بھی ہیں، سماجی بھی، اور اقتصادی بھی، اسی طرح اسلام مال کے ارتکاز کو روکتا ہے، اس سے اقتصادی سرگرمی متاثر ہوتی ہے، مال کی گردش کے لئے اسلام جوئے کو حرام قرار دیتا ہے، اور اس بات سے بھی روکتا ہے کہ مال گردش کر کے صرف چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے، البتہ مال کی گردش کے لئے اسلام جائز طریقہ سے تجارت کی ترغیب دیتا ہے۔

۲۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ مالی معاملات میں نزاعات سے بچنے کے لئے معاملہ کو واضح کرنے کا حکم دیتا ہے، چنانچہ معاملہ کو قید تحریر میں لانے، اس پر گواہ بنانے، اور رہن وغیرہ رکھنے کا حکم دیتا ہے تا کہ معاملات صاف اور واضح رہیں۔

۳۔ تیسرا مقصد یہ ہے کہ مال کے تعلق سے لوگوں کے درمیان عدل پیدا ہو، چنانچہ ایک طرف وہ نیک کاموں میں خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے اور دوسری طرف بخل وکنجوسی سے منع کرتا ہے اور اسراف وتبذیر کو بھی حرام بتاتا ہے اسی طرح اپنی ذات پر خرچ، اپنے اعزاء واقارب پر خرچ، زکاۃ کی ادائیگی اور محتاج وضرورت مندوں کی حاجت روائی کے احکام دے کر اسلام خرچ کرنے کے جذبے کو فروغ دیتا ہے۔

مال کے تحفظ کے لئے شریعت نے کچھ منفی احکام بھی دیئے ہیں، چنانچہ اس نے مال پر دست درازی کو حرام قرار دے کر ایسا کرنے والے کے لئے سزا رکھی ہے، نیز اسلام نے ناجائز طریقے سے دوسرے کا مال کھانے کو حرام قرار دیا، چوری کرنے والے کی سزا مقرر کی، ڈاکہ زنی کے لئے بہت سخت سزا مقرر کی اور دوسرے کے مال کو ہتھیانے اور اسے نقصان پہنچانے کے دوسرے طریقوں کو بھی ممنوع بنایا، مال کے منافع کو برقرار رکھنے اور عدل کے تحفظ کے لئے رشوت کو بھی اسلام نے حرام قرار دیا" (مقاصد شریعت: تعارف وتطبیق ۳۴۷۔۳۴۸)۔

اسی طرح مال کے وجود کے لئے مختلف مالی معاملات کو جائز قرار دیا گیا اور اس کے حصول کی کوشش کو وجوب کا حکم دیا گیا، قرآن وحدیث میں جائز طریقے سے مال کی کمائی پرزور دیا گیا اور ناجائز طریقے سے منع کیا گیا، ارشاد ربانی ہے:

"**هو الذی خلق لکم ما فی الأرض جمیعاً**" (سورۃ البقرہ:۲۹) (وہی ہے جس نے زمین کی تمام چیزوں کو تمہارے نفع کے لئے پیدا کیا)۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

"**ولقد مکناکم فی الأرض وجعلنا لکم فیها معایش، قلیلاً ما تشکرون**" (سورۃ الاعراف:۱۰) (اور بے شک ہم نے تم کو زمین میں رہنے کی جگہ دی اور اس میں تمہارے لئے اسباب معیشت فراہم کئے، مگر تم لوگ بہت ہی کم شکریہ ادا کرتے ہو)۔

ایک جگہ ارشاد ربانی ہے:

"**فإذا قضیت الصلاة فانتشروا فی الأرض وابتغوا من فضل الله**" (سورہ جمعہ:۶۲)۔

(جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کے فضل (مال وتجارت ورزق) کو تلاش کرو)۔

ایک اور جگہ فرمان باری ہے:

"**لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل إلا أن تکون تجارة عن تراض منکم**" (سورہ نساء:۲۹)۔

(اپنے اموال کو آپس میں باطل طریقے سے نہ کھاؤ، بلکہ باہمی رضامندی کے ساتھ تجارت کی راہ سے نفع حاصل کرو)۔

مال ودولت کو "**قیاماً للناس**" سے تعبیر کیا گیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**الکاسب حبیب الله**" (روح البیان ۲۲۹/۵) (محنت ومشقت کرکے روزی کمانے والا اللہ کا

حبیب ہے)۔اسی طرح آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :''اپنے ہاتھ کی کمائی سے بہتر کھانا کسی نے نہیں کھایا اور اللہ تعالی کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی کھاتے تھے'' (بخاری ۱/۲۷۸)۔

اسی طرح ایک اور جگہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :''**طلب الحلال فریضة بعد الفریضة**'' (رواہ الطبرانی ومشکوۃ ۱/۲۴۲) (حلال مال کا طلب کرنا دوسرے فرائض کی ادائیگی کے بعد ایک اہم فرض ہے)۔

اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے :''آدمی اپنی پشت پر لکڑیاں لاد کر اس کو بیچ کر کھائے یہ اس کے لئے بہتر ہے کہ کسی سے سوال کرے پھر وہ اس کو دے یا نہ دے'' (بخاری: کتاب البیوع ۱/۲۰۷۴)۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: تم میں سے کوئی بے روزگار نہ بیٹھے یہ دعا کرتے ہوئے کہ اے اللہ مجھے رزق دے، کیونکہ تم جانتے ہو کہ آسمان سونا چاندی نہیں برساتے (احیاء علوم الدین، کتاب آداب الکسب والمعاش، ص:۱۱۱)۔

غرض یہ کہ حیات انسانی کی بقا کے لئے مال کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اسی لئے قرآن واحادیث اور آثار صحابہ میں مال کی اہمیت، جائز طریقوں سے مال حاصل کرنے پر زور، جائز راستوں میں خرچ کرنے کی فضیلت اور ناجائز طریقے سے کمانے اور خرچ کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

خلاصہ یہ نکلا کہ یہ پانچوں مقاصد ان امور اور ان اصول وکلیات میں سے ہیں جو دین حق کے بنیادی مقاصد قرار دیئے گئے ہیں، یہاں تک کہ دنیا کی دوسری شریعتوں، مذاہب اور صالح قوانین میں بھی کسی نہ کسی حد تک ان امور کی رعایت رکھی گئی ہے، لیکن جس جامعیت کے ساتھ اسلام نے ان امور کی حفاظت پر زور دیا ہے، اور اس کے لئے قوانین وضع کئے ہیں، وہ اسی کا امتیاز ہے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ ان پانچوں مقاصد کی اہمیت کے تعلق سے لکھتے ہیں: جو ضروریات خمسہ ہیں، یہ سب محفوظ ہوں اور ترقی کریں، ضروریات کی حد تک تو یہ سب کے لئے محفوظ ہونی چاہیئے، اگر معاشرے کے ہر فرد کے لئے یہ چیزیں مکمل طور پر محفوظ ہیں، اور ان کا تحفظ سب کو حاصل ہے، تو ترقی کا ایک درجہ حاصل ہو گیا۔ دوسرا درجہ ترقی کا یہ ہے کہ ضروریات کی تکمیل کے بعد حاجیات کی تکمیل سب کے لئے ہو، اگر معاشرے کے تمام انسانوں کے لئے، یا معاشرے کی غالب ترین آبادی کے لئے حاجیات کی مکمل تکمیل کا بندوبست ہو گیا ہو، تو یہ ترقی کا دوسرا درجہ ہے۔ اس کے بعد جہاں تک تحسینیات کا تعلق ہے تو وہ بقدر وسائل معاشرے میں حاصل ہونے چاہئیں، اللہ تعالی زیادہ وسائل میسر رمہیا فرمائے تو تحسینیات کم ہوگی، آگے لکھتے ہیں: اس پورے کام کے لئے عدل اجتماعی کو پیش نظر رکھنا ناگزیر ہے، ضروریات کی تکمیل کے لئے بھی، حاجیات کی تکمیل کے لئے بھی اور تحسینیات کی تکمیل کے لئے بھی (محاضرات فقہ ر ۱۰۴)۔

اسی طرح امام غزالی ان پانچوں مقاصد کے تعلق سے تحریر فرماتے ہیں:

"ومقصود الشرع من الخلق خمسة، وهو أن يحفظ عليهم: دينهم، ونفسهم، وعقلهم، ونسلهم، ومالهم، فكل ما يتضمن حفظ هذه الأصول الخمسة فهو مصلحة، وكل ما يفوت هذه الأصول فهو مفسدة، ودفعها مصلحة" (المستصفی فی علم الاصول ار ۱۷۴ شاملہ)۔

(خلق خدا کے بارے میں شریعت کے مقاصد پانچ ہیں اور وہ یہ ہیں کہ ان کے دین، ان کی جان، ان کی عقل، ان کی نسل اور ان کے مال کی حفاظت کی جائے، پس ہر وہ بات جو ان اصول خمسہ کی حفاظت کی ضامن ہو وہ "مصلحت" قرار پائے گی، اور ہر وہ چیز جس میں یہ اصول خمسہ نہ پائے جائیں وہ "مفسدہ" ہے، اور جن چیزوں سے یہ مقاصد فوت ہوں، وہ "مفسدہ" کہلائے گی اس کا ازالہ "مصلحت" ہوگا)۔

ضروریات:

ضرورت یہ ہے کہ وہ دینی ودنیوی مصالح کے قیام کے لئے ضروری ہو بایں طور کہ اگر وہ موجود نہ ہوتو دنیا کے مصالح ٹھیک طور پر نہ چل سکیں، بلکہ ان میں فساد، انتشار اور زندگی کے فوت ہونے کا خدشہ لاحق ہو اور (اس کے ترک کرنے میں) آخرت میں نجات اور نعمتوں سے محرومی اور واضح خسارے کے ساتھ لوٹنے کا خدشہ ہو (الشاطبی: الموافقات ۲/ ۱۷)۔

کیوں کہ ضرورت کا تحقق صرف جان کے تحفظ کے لئے ہی نہیں ہوتا، بلکہ دیگر مقاصد شریعت کے تحفظ کے لئے بھی ضرورت متحقق ہوتی ہے، اس لئے ضرورت کے تصور کو صرف اور صرف انسانی جان کے تحفظ کے ساتھ خاص کر دینا مناسب نہیں ہے۔ دوسرے موقف کے فقہاء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ ضرورت کا اطلاق عبادات، جنایات اور معاملات سب میں ہوتا ہے، جیسے امام شاطبیؒ معاملات پر ضرورت کے اطلاق سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''**والمعاملات ما كان راجعاً إلى مصلحة الإنسان مع غيره، كانتقال الأملاك بعوض أو بغير عوض، بالعقد على الرقاب أو المنافع أو الأبضاع**'' (الشاطبی: نفس مصدر ۲/ ۱۸)۔

(اور معاملات بھی جب کہ وہ انسان کے ساتھ کسی دوسرے کی مصلحت کی طرف راجع ہوں، جیسے عوض یا بغیر عوض املاک کا انتقال، غلام کی آزادی یا منافع پر معاہدے کے ساتھ (ملکیت کا انتقال)، یہاں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مالی معاملات میں بھی ضرورت متحقق ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ ضرورت کا دائرہ کار میں اضطراری نوعیت کے احکام بھی آتے ہیں نیز وہ احکام بھی جو اس سے کم درجے پر ہیں، وہ بھی جن کا مقصود انسانی حیات کا تحفظ ہے اور وہ بھی جن کا مقصد انسان کے دیگر اہم مفادات کا تحفظ ہے۔ شریعت میں اس شخص کو بھی مضطر شمار کیا گیا ہے جس کا مال خطرے میں ہو، کیوں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے: ''**من قُتلَ دون**

ماله فهو شهيد" (محمد بن اسماعیل البخاری، الصحیح البخاری، کتاب المظالم والغضب، باب من قاتل دون ماله (دارطوق النجاۃ، ۱۴۲۲ھ) ۳: ۱۳۶، رقم: ۲۴۸۰) (جو شخص اپنی مال کی حفاظت میں قتل ہوجائے وہ شہید ہے)۔ ایک اور حدیث میں فرمایا کہ اگر اس لڑائی کے دوران غاصب مارا جائے تو وہ جہنمی ہوگا (مسلم بن الحاج، الصحیح المسلم، کتاب الایمان) (اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ضرورت کا اطلاق مال کے تلف ہونے پر بھی ہوتا ہے)۔

ضرورت کا تحقق اور شرعی رخصت:

ضرورت شریعت کے احکام میں رخصت پیدا کرتی ہے تاکہ مکلف کو کسی ایسی مشقت اور حرج سے بچایا جاسکے جو اس کے کسی ایسے مفاد کو تلف کرسکتی ہو جس کا تعلق مقاصد خمسہ سے ہو۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں: "**إن كانت الضرورة فإن دين الله يسر**" (محمد طاہر ابن عاشور، التحریر والتنویر (تونس: الدار التونسیہ للنشر، ۱۹۸۴ء) ۲/ ۴۸۸)۔

(اگر ضرورت متحقق ہوجائے تو بے شک اللہ کا دین سراپا آسان ہے)، اسی بابت فقہاء نے ضرورت کا ایک ضابطہ دیا ہے جس سے رخصت مستفاد ہوتی ہے: "**الضرورات تبيح المحظورات**" (مجلۃ الاحکام العدلیہ، کراچی: نور محمد، کارخانہ تجارت کتب، آرام باغ، المادہ: ۱۸-۲۱) (ضرورتیں ممنوع چیزوں کو مباح کردیتی ہیں) تاہم کسی امر کے ضرورت میں سے ہونے کے لئے مندرجہ ذیل شرائط کا ایک ساتھ پایا جانا لازمی ہے:

۱۔ وہ ضرورت ظنی نہ ہو بلکہ یقینی ہو، مثلاً اگر ضرورت کے تحت اسے رخصت نہ دی گئی تو بندہ اپنا مال یقینی طور پر ضائع کر بیٹھے گا۔

۲۔ ضرورت صرف اس وقت متحقق ہوگی جب کہ حرام معاملے کے ارتکاب کے علاوہ اور کوئی صورت ہی نہ بچی ہو اور اس کے ارتکاب سے مشقت وحرج سے خلاصی بھی یقینی ہو۔

۳۔ وہ ضرورت کسی دوسرے انسان کے اسی درجے یا کسی بڑے درجے کے حق کو تلف بھی نہ کرتی ہو (السیوطی: الاشباہ والنظائر ۱/ ۸۴)، مثال کے طور پر اگر کسی کو دھمکی دی گئی ہو کہ وہ

دوسرے کا مال جلا دے ورنہ اسی طرح کا اس کا اپنا مال جلا دیا جائے گا تو اس صورت میں مکرہ کے لئے ضرورت متحقق نہیں ہوگی کہ جس پر وہ عمل کرتے ہوئے دوسرے کا مال جلا دے، لیکن اگر اسے جان کی دھمکی ہو تو پھر ضرورت متحقق ہوگی، اور اسے دوسرے کا مال جلانے کی رخصت حاصل ہوگی تاہم اس بات پر فقہاء کا اختلاف ہے کہ مال کا تاوان کون ادا کرے گا؟ احناف، حنابلہ اور بعض شوافع کے نزدیک تاوان کا مطالبہ مکرہ سے کیا جائے گا (الزحیلی: نظریۃ الضرورۃ الشرعیہ/۹۱)۔

۴۔ ضرورت عارضی طور پر اور محدود مقدار میں مؤثر ہوگی بایں طور کہ جیسے ہی ضرورت پوری ہوگی تو رخصت بھی ختم ہو جائے گی، جیسے فقہی قاعدہ ہے: **"ما أبيح للضرورة يتقدر بقدرها"** (مجلۃ الاحکام العدلیہ، المادہ: ۲۲۔۱۸) (جو چیز ضرورت کی وجہ سے مباح کی جاتی ہے وہ صرف بقدر ضرورت ہی مباح ہوتی ہے)۔

حاجیات:

یہ وہ وسائل ہیں جن سے انسانی حاجات وابستہ ہیں، یہ ضرورتیں گو فوری اور شدید نہیں ہوتیں، لیکن اہم ضرور ہوتی ہیں، نیز تنگی کو دور کرنے کے لئے ان مقاصد کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، کیوں کہ اگر ان مقاصد کی رعایت نہ کی جائے تو مکلفین فی الجملہ تنگی اور مشقت میں مبتلا ہو جائیں گے۔ ان انسانی حاجات میں شریعت نے عموماً رخصت اور آسانی کو ملحوظ رکھا ہے، جیسے مرض و سفر کی وجہ سے جو مشقت لاحق ہوتی ہے اس کے لئے شریعت نے تخفیف کی غرض سے رخصتیں دی ہیں، مثلاً: مریض اور مسافر کے لئے روزہ نہ رکھنے کا جواز، مسافر کے لئے چار رکعات والی فرض نماز میں قصر، پانی نہ پائے جانے کے وقت تیمم کی اجازت اور قیام سے عاجز شخص کے لئے بیٹھ کر نماز پڑھنے کا جواز وغیرہ۔

"یا اسی طرح عادات میں مقاصد حاجیہ کی مثال جیسے مضاربت، مساقات، بیع سلم اور وہ تمام معاملات جن پر پانچوں ضروریات کی حفاظت موقوف نہیں ہے" (اسلامی شریعت کا عمومی نظریہ/۱۱۷)۔

خلاصہ یہ کہ یہ اور اس طرح کی دیگر سہولیات اور رخصتیں صرف اس لئے ہیں تا کہ انسان اپنی استطاعت کے حدود میں رہتے ہوئے دینی ارکان کو بجالا سکے اور انھیں محفوظ رکھ سکے۔

اسی طرح قرض کے لین دین کی اجازت، کسی دوسرے کی طرف سے حق کے بارے میں ضامن وکفیل بننے کی اجازت اور ضرورت پڑنے پر بیع کو فسخ کرنے کی اجازت وغیرہ۔

ڈاکٹر محمد ہاشم کمالی حاجیات کے تعلق سے اپنی کتاب ''مقاصد شریعت آسان اور مختصر تعارف'' (ص ۱۲) میں لکھتے ہیں:

''اس دوسری قسم کی مصلحت جب پورے معاشرے سے متعلق ہوتی ہے تو پہلی قسم بھی اس میں شامل ہوجاتی ہے، مثال کے طور پر فرد کے لئے عقد ایجار کی صحت ثانوی درجہ کی اہمیت کی حامل ہوتی ہے لیکن پورے معاشرے کے اعتبار سے ضرورت تک جا پہنچتی ہے، اسی طرح عبادات کے سلسلہ میں اسلام کی عطا کردہ بعض رخصتیں فرد کی بقا کے لئے تو دوسرے درجہ کی اہمیت رکھتی ہیں لیکن معاشرے کے اعتبار سے پہلے درجہ کی ہوجاتی ہیں، اسی طرح دوسری قسموں کے مصالح میں تنازع کی صورت میں کم درجہ کی مصلحت کو اعلی درجہ کی مصلحت کے حصول کے لئے قربان کردیا جائے گا، لیکن اگر کبھی مختلف مصالح کے درمیان ایسا تنازع پایا جائے کہ ان کے درمیان زیادہ اہم مصلحت کا قطعیت کے ساتھ پتہ نہ چل سکے تو ایسی صورت میں دفع مفسدہ کو جلب مصلحت پر ترجیح دی جائے گی (ملاحظہ ہو یوسف القرضاوی: المدخل لدراسات الشریعۃ الاسلامیہ قاہرہ، مکتبہ وہبہ/ ۷۰۔۷۱)۔

اس لئے کہ شریعت برائی کے روکنے کو سب سے پہلا مقام دیتی ہے، اس کی وضاحت آپ ﷺ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا: ''جب میں تمہیں کسی کام کے کرنے کا حکم دوں تو اس پر جتنا عمل کرسکو کرو، لیکن جب کسی چیز سے روکوں تو اس سے مکمل اجتناب کرو'' (نسائی، کتاب المناسک، باب وجوب الحج/ ۲۶۱۹)۔

پھر تینوں مقاصد کا ایک دوسرے سے ربط کیا ہے، اس تعلق سے ڈاکٹر نورالدین مختار

الخادمی لکھتے ہیں:

''مقاصد ضروریہ، حاجیہ، تحسینیہ، تینوں مقاصد کا آپس میں ایک دوسرے سے ربط وتعلق ہے، ان میں سے بعض بعض کے تابع اور بعض دوسرے کی تکمیل کے لئے ہیں۔

مقاصد ضروریہ ہی تمام مقاصد کی اساس اور بنیاد ہیں، اس کے بعد مقاصد حاجیہ، پھر سب سے اخیر میں مقاصد تحسینیہ کا درجہ ہے، مقاصد حاجیہ ضروریات کا تکملہ، اور مقاصد تحسینیہ حاجیات وضروریات دونوں کا تکملہ ہیں (علم مقاصد الشریعہ/۹۸، مترجم ضیاء الدین قاسمی ندوی)۔

تحسینیات:

تحسین کے معنی ہیں خوبصورت بنانا، اچھا کرنا، یعنی ایسی مصلحتیں اور ایسے اہداف جن کی رعایت انسانی کردار وگفتار میں حسن وخوبی کا باعث ہوں، یعنی جن کا تعلق اخلاق وعادات اور زندگی کے آداب سے ہو، مروت اور عقل انسانی کا تقاضا ہے کہ ان مصالح کو حاصل کیا جائے لیکن ان کی رعایت پر نہ تو زندگی موقوف ہو اور نہ ان کی عدم رعایت سے تنگی اور مشقت کا اندیشہ ہو، امام شاطبی کے بقول تیسرا درجہ مصالح کا وہ ہے جو نہ ''ضرورت'' کے خانہ میں آتا ہو اور نہ ''حاجت'' کے، لیکن اس کا شمار ان امور میں ہوتا ہو جن کو تحسین وتزئین کے لئے اختیار کیا جاتا ہے اور عادات ومعاملات میں جس کی رعایت مستحسن سمجھی جاتی ہے'' (الموافقات/۲۹۰)۔

عبادات میں جیسے نفلی نمازیں، روزے، بیع وشراء اور معاملات میں جیسے ناپاک چیزوں کی خرید وفروخت کی ممانعت، کھانے پینے میں پاکیزہ چیزوں کا اہتمام اور خبائث سے اجتناب، پانی اور چارہ کی زائد مقدار کی فروخت اور اسی طرح ایک مسلمان بھائی کی بیع کے دوران دوسرے شخص کے بھاؤ لگانے سے ممانعت وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ ''مصالح تحسینیہ'' وہ مصالح ہیں جن سے امت کے نظام میں ان کی بہتر حالت درجہ کمال کو پہنچ جائے تاکہ وہ امن وسلامتی اور سکون کی زندگی بسر کر سکے اور دوسری امتوں کے بیچ اتحاد واتفاق کا ایسا مظہر ہو کہ وہ ملت اسلامیہ کے قریب آجائیں اور اس میں داخل

ہونے کی رغبت کریں، حسن اخلاق وعادات بھی اسی ضمن میں آجاتے ہیں (مقاصد الشریعۃ الاسلامیہ لابن عاشور/ ۸۲)۔

مقاصد شریعت کی تقسیم:

ارباب علم ونظر نے مختلف اور متنوع جہات سے مقاصد شریعت کو متعدد اقسام میں تقسیم کیا ہے، ڈاکٹر جمال الدین عطیہ لکھتے ہیں:

''معاصر علماء نے شریعت کے عمومی مقاصد کی تفصیل کی ہے اور مختلف زاویوں سے ان مقاصد کی تقسیم کی ہے:

۱۔ مقاصد کی تقسیم ان کی قوت کے اعتبار سے، مثلاً مصلحت ضروریہ، مصلحت حاجیہ اور مصلحت تحسینیہ۔

۲۔ مقاصد شریعت کی تقسیم اس اعتبار سے کہ ان کا تعلق پورے امت سے ہے یا جماعتوں سے یا افراد سے، اس اعتبار سے علماء نے اس کی دو قسمیں کی ہیں: کلیہ اور جزئیہ۔

۳۔ مقاصد کی تقسیم اس اعتبار سے بھی کہ ان مقاصد کی حیثیت قطعی ہے یا ظنی۔

۴۔ مقاصد کی تقسیم اس اعتبار سے کہ شریعت ان کی شہادت دیتی ہے یا نہیں۔

۵۔ مقاصد کی تقسیم اس اعتبار سے کہ وہ مقاصد دائمی اور ناقابل تغیر ہیں یا عارضی اور تغیر پذیر۔

۶۔ مقاصد کی تقسیم اس اعتبار سے بھی کہ وہ مقاصد افعال سے قصداً حاصل ہوتے ہیں یا انجام کے اعتبار سے حاصل ہوتے ہیں۔

پہلی تقسیم: درجہ اور مرتبہ کے لحاظ سے:

اس کی تین قسمیں ہیں: ضروریات، حاجیات، تحسینیات۔

شریعت کی نگاہ میں ان کی اہمیت اسی ترتیب سے ہے، یعنی پہلے ضروریات، اس کے

بعد حاجیات اور آخر میں تحسینیات، اور مقاصد شریعت کی اصل تقسیم بھی یہی ہے، جن کی تفصیل پیچھے کی جا چکی ہے۔

دوسری تقسیم: مقصود کے اعتبار سے:

بعض مقاصد اصالتاً مقصود ہوتے ہیں، اور بعض تبعاً، اس زاویے سے مقاصد شریعت کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں:

۱۔ مقاصد اصلیہ، یہ از خود اصلاً مقصود ہوتے ہیں، جیسے نماز۔

۲۔ مقاصد تبعیہ، یہ مقاصد اصلیہ کے تابع ہوتے ہیں، جیسے نماز کے لئے وضو۔

تیسری تقسیم: وسعت و جامعیت کے اعتبار سے:

شرعی احکام کے مقاصد عمومی و کلی نوعیت کے بھی ہیں اور جزوی و خصوصی انداز کے بھی، اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو مقاصد شریعت کی تین قسمیں سامنے آتی ہیں: مقاصد عامہ، مقاصد خاصہ، مقاصد جزئیہ۔

۱۔ مقاصد عامہ:

ان سے مراد وہ مقاصد و غایات ہیں جو تمام شرعی احکام میں ملحوظ رکھے گئے ہیں اور کسی ایک شعبہ کے احکام کے ساتھ خاص نہیں ہیں، مثلاً منافع و مصالح کا حصول، نقصان و مضرت کا دفعیہ اور آسانی و رفع حرج، شریعت کے دو عام مقاصد ہیں جن کی رعایت تمام شرعی احکام میں رکھی گئی ہے۔

۲۔ مقاصد خاصہ :

احکام شریعت کے کسی ایک معین اور مخصوص گوشے میں جو اہداف شارع کے پیش نظر ہوں، انہیں مقاصد خاصہ کا نام دیا گیا ہے، عبادات سے متعلق مقاصد، مقاصد خاصہ میں

شمار ہوتے ہیں، جیسے امت مسلمہ کی حفاظت، دین کو زوال سے بچانا، قرآن پاک کی اس بات سے حفاظت کہ وہ مکمل طور سے ناپید ہوجائے یا اس میں عمومی پیمانہ پر تحریف کردی جائے، حفاظ قرآن کے ختم ہوجانے سے یا مصاحف کے تلف ہوجانے سے، اسی طرح معاملات میں بھی انسانوں کے مصالح حقیقی مقصود ہیں، اسی بنا پر ان میں مفاہیم ومعانی کی طرف زیادہ توجہ ہوتی ہے۔

۳۔مقاصد جزئیہ:

شریعت کے وہ مقاصد جو کسی خاص حکم کی پشت پر کارفرما ہوں، یعنی جن کا تعلق ایک فرد یا چند قلیل افراد کی مصلحت سے ہو، مقاصد جزئیہ کہلاتے ہیں، مثلاً نماز کا مقصد یاد خداوندی اور روزہ کا مقصد حصول تقوی ہے، اس کی بھی کئی اقسام اور متعدد مراتب ہیں، شریعت نے عبادات یہاں تک کے معاملات میں بھی ان جزئی مصلحتوں کی حفاظت کی ہے۔

چوتھی تقسیم: یقین وظن کے اعتبار سے:

شرعی احکام کے مقاصد کا قطعیت وظنیت کے پہلو سے جائزہ لیا جائے، یعنی کہ مقاصد شریعت کی اس تقسیم سے منفعت کا حصول یا فساد کا ازالہ کس درجہ کا ہے، تو اس اعتبار سے اس کی تین قسمیں نکلیں گی:

مقاصد قطعیہ، ظنیہ اور وہمیہ۔

۱۔مقاصد قطعیہ:

یہ وہ مقاصد ہیں، جن کے اثبات پر دلائل ونصوص تواتر سے موجود ہیں، یا ڈاکٹر جمال الدین عطیہ کے الفاظ میں ''قطعی وہ مقاصد ہیں جن پر ایسے ادلہ دلالت کریں جو ان نصوص کے قبیل سے ہوں، جن میں کسی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے، یا وہ مقاصد جو قرآن میں

آئے ہوئے مکرر ادلہ سے ماخوذ ہوں، جن میں تکرار کی وجہ سے مجاز اور مبالغہ مراد ہونے کا احتمال ختم ہو جاتا ہے مثلاً تیسیر (آسانی پیدا کرنا) کا مقصد شارع ہونا، امن، حفظ ناموس وآبرو اور حفاظت اموال وغیرہ (اسلامی شریعت کا عمومی نظریہ/ ۱۲۵)۔

۲۔مقاصد ظنیہ :

وہ مقاصد ہیں جن کے دلائل درجۂ قطعیت کو نہیں پہنچے، بلکہ ان کی توجیہ وتاویل میں غور وفکر اور بحث ونظر کا عمل دخل ہے، جیسے فساد عقل کا موجب بننے والی اشیاء کی ممانعت کا سد باب کرنا، اس سلسلہ میں نشہ آور اشیاء کی قلیل مقدار کی حرمت کا مقصد یہی بتا تا ہے کہ اس سے خرابی عقل کا انسداد ہوتا ہے۔

۳۔مقاصد وہمیہ :

جن امور سے متعلق یہ گمان ہوتا ہو کہ ان میں مصلحت موجود ہے، لہذا یہ مقاصد شریعت میں شامل ہیں لیکن درحقیقت معاملہ اس کے برعکس ہو تو انہیں مقاصد وہمیہ میں شمار کیا جائے گا، اہل علم کی اصطلاح میں انہیں ''مصالح ملغاۃ'' کا نام بھی دیا جاتا ہے، مثال کے طور پر یہ سمجھنا کہ جوئے میں نفع ہے، حالانکہ وہ قطعا حرام ہے، یعنی یہ وہ مقاصد ہیں جن میں صلاح وخیر کا پہلو ذہن وخیال کو محسوس ہوتا ہے لیکن غور کرنے سے وہ چیز مضر اور نقصان دہ معلوم ہوتی ہے۔

پانچویں قسم: افراد کے اعتبار سے:

اس پہلو سے مقاصد شریعت کی دو قسمیں ہیں:

مقاصد کلیہ :

جو مقاصد تمام امت یا بڑی اکثریت سے متعلق ہوں مقاصد کلیہ کہلاتے ہیں، مثلاً نظم

اجتماعی کا قیام وحفاظت، قرآن وسنت کو تحریف وتبدیل سے محفوظ رکھنا، معاملات کی تنظیم، باہمی تعاون اور ہمدردی وغیرہ۔

مقاصد بعضیہ :

وہ مقاصد ہیں جو بعض لوگوں کے مفاد میں ہوں اور براہ راست کچھ لوگ ہی ان سے مستفید ہوں، مثلاً تجارت سے فائدہ اٹھانا، حق مہر، اولاد سے انس ومحبت وغیرہ (مستفاد از مقاصد شریعت: جاسر عودہ، اسلامی شریعت کا عمومی نظریہ: جمال الدین عطیہ، الموافقات: شاطبی، مقاصد شریعت: تعارف وتطبیق: مولانا خالد سیف اللہ رحمانی وغیرہ)۔

امام شاطبی نے مقاصد کی ایک اور تقسیم کرتے ہوئے انہیں ''مقاصد شارع'' اور ''مقاصد مکلف'' میں تقسیم کیا ہے، مقاصد شارع کی مثال انسانوں کے لئے پاکیزہ اور مفید زندگی کو یقینی بنانا ہے، یہ مقصد اللہ تعالی کے ان اہم ترین مقاصد میں سے ہے جن پر احکام شریعت کی بنیاد ہے۔

دوسری قسم (مقاصد مکلف) کی مثال ہے، انسان کا زندگی کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے روزگار ڈھونڈنا، یہ مکلف (انسانوں) کا ایک مقصد ہے (مقاصد شریعت: آسان تعارف/۱۵)۔

اسی طرح شریعت کے تمام مقاصد یا تمام احکام اور ہر چیز میں ایک درجہ کمال یا تکمیل کا ہوگا، جس کے بے شمار مزید درجات ہوسکتے ہیں، اس لئے کہ تکمیل اور کمال کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہر اچھی اور مفید چیز میں حدود شریعت کے اندر کمال کا حصول پسندیدہ ہے، یعنی شریعت نے ایسے بہت سے دوسرے احکام بھی مشروع کئے ہیں جو ان مقاصد کو پورا کرنے میں پہلے والے احکام کی تکمیل کرتے ہیں۔

مکملات مقاصد کی درجہ بندی ان کی اہمیت کے پیش نظر کی جاتی ہے، جب کہ ان کی تکمیل جلب منفعت (منفعت کے حصول) اور دفع مضرت (نقصان کے دور کرنے) جیسے اصولوں کے تحت ہوتی ہے۔

مکملات مقاصد:

ضروریات:

وہ اہم مکملات ہیں، جن کے نہ ہونے سے مقاصد شریعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو، جیسے کہ مال کے تحفظ کے لئے چور کا ہاتھ کاٹنا ایک ضروری امر ہے، حالانکہ ہاتھ کاٹنا ازخود مقصود نہیں، بلکہ اس اقدام سے مقصود مال کا تحفظ ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر یہ امر ضرورت کے درجے میں ہے، اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ہاتھ کاٹنا دفع مضرت کے معنی میں مکملات مقاصد میں سے ہے، اسی طرح مال کے تحفظ کے لئے عوض (بیع اجارہ کی صورت میں) یا بغیر عوض (ہبہ کی صورت میں) ملکیت کا انتقال ایک ضروری امر ہے، ملکیت کا انتقال چونکہ مال کے تحفظ کی ضمانت ہے، اس لئے یہ جلب منفعت کے معنی میں ضرورت کے درجہ پر ہے (خلاصہ از الموافقات ۲/ ۱۸)، یعنی عمومی طور پر شریعت کا یہ اصول ٹھہرا کہ جس چیز کے بغیر واجب مکمل نہیں ہوتا وہ چیز واجب ہوتی ہے، اور ہر وہ چیز جو ناجائز تک پہنچادے وہ خود ممنوع ہے۔

حاجیات:

وہ مکملات ہیں جن کے نہ ہونے سے مقاصد تو فوت نہیں ہوتے لیکن مقاصد میں خلل ضرور واقع ہوتا ہے، جیسے اجارہ، سلم اور استصناع کے عقود کو جائز قرار دینا تاکہ انسان کو زندگی کی بنیادی سہولیات بہم ہوسکیں۔ اگر ان مقصود کو ناجائز قرار دیا جاتا تو زندگی میں حرج اور تنگی لازم آتی، اس لئے یہ عقود جلب منفعت کے معنی میں حاجت کے درجہ پر ہیں، حکومت وقت کا ضرائب یعنی ٹیکسوں کا نافذ کرنا کہ اگر نہ کرے تو ریاستی معاملات میں حرج لازم آئے گا، یہ دفع مضرت کے معنی میں حاجت میں سے ہے (خلاصہ از المدخل الفقہی العام: مصطفی احمد الزرقا ۱/ ۱۰۶)۔

ڈاکٹر جمال الدین عطیہ لکھتے ہیں:

''شریعت نے مختلف قسم کے معاملات بیع، اجارہ، شرکت وغیرہ کو جو مشروع کیا ہے تو ان کے مقاصد کی تکمیل ان احکام سے ہوتی ہے کہ شریعت نے عذر، جہالت اور معدوم کی بیع سے منع کیا ہے اور یہ بیان کیا ہے کہ کن شرطوں کا عقد کے ساتھ جڑا ہوا ہونا صحیح ہے اور کن کا عقد سے مربوط ہونا درست نہیں ہے، اور اس طرح کے دوسرے وہ احکامات جن کا مقصد یہ ہے کہ اختلافات اور نزاعات کو بھڑکائے بغیر لوگوں کی معاملاتی ضرورتیں پوری ہوجائیں'' (اسلامی شریعت کا عمومی نظریہ/۱۱۹)۔

تحسینیات:

اسی طرح تحسینیات وہ مکملات ہیں جن کے نہ ہونے سے مقاصد فوت نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہی ان میں خلل واقع ہوتا ہے، اسی لئے انہیں فضولیات بھی کہا جاتا ہے، جس طرح بیش قیمت لباس، گاڑی وغیرہ کہ جن کے نہ ہونے سے نہ تو کوئی مقصد شرعی فوت ہوتا ہے اور نہ ہی ان میں خلل واقع ہوتا ہے۔

مثلاً شریعت نے نفل ادا کرنے کو مستحب قرار دیا ہے، اس کے ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ شروع کرنے سے نفل واجب ہوجاتی ہے، اسی طرح شریعت نے نفلی صدقہ کو مستحب قرار دیا ہے، ساتھ ساتھ یہ تعلیم بھی دی کہ پاکیزہ کمائی میں سے اللہ کے راستے میں خرچ کیا جائے وغیرہ۔

علماء نے لکھا ہے کہ جو احکام ضرورت کی حفاظت کے لئے مشروع کئے گئے ہیں وہ سارے احکام میں سب سے زیادہ اہم، ضروری اور سب سے زیادہ قابل لحاظ ہوتے ہیں، اس کے بعد ان احکام کا نمبر آتا ہے جو امور حاجیہ کے لئے مشروع کئے گئے ہیں، سب سے آخر میں وہ احکام آتے ہیں جن کی مشروعیت امور تحسینی کے لئے ہوئی ہے۔

احکام کی ان تینوں قسموں میں سے ہر قسم اپنے سے اوپر والی قسم کی تکمیل کرنے والی ہے، لہذا اگر حکم تحسینی پر عمل کرنے میں حکم ضروری یا حکم حاجی میں خلل واقع ہوتا ہو تو حکم تحسینی

قابل لحاظ نہیں ہوگا، جیسے کوئی شخص بھوک کی وجہ سے ہلاکت کے قریب ہوتو اس کے لئے مردار کھانا مباح ہوگا، کیونکہ مردار کھانے سے بچنے کا حکم تحسینی ہے، اور جان کی حفاظت امر ضروری ہے، یا اسی طرح معدوم کی بیع سلم میں جائز قرار دی گئی ہے، جس طرح مزارعت اور مساقات میں جہالت معاف کی گئی ہے، اس لئے کہ لوگوں کی حاجت اس بات کی متقاضی ہے کہ ان مواقع میں تحسینیات کی رعایت نہ کی جائے، اسی طرح اگر حاجت والے احکام کی رعایت کرنے میں حکم ضروری میں دخل واقع ہوتا ہوتو حاجت والا حکم قابل رعایت نہیں ہوگا۔

ہاں البتہ حکم ضروری کی رعایت بہرحال ضروری اور واجب ہے، اس کی ادائیگی میں کوتاہی جائز نہیں ہوگی، سوائے اس کے کہ اس سے زیادہ اہم ضروری احکام کی حفاظت کے لئے اس کا ترک کرنا ضروری ہو، اسی لئے دین کی حفاظت کے لئے جہاد واجب ہے، حالانکہ جہاد میں جان کی قربانی دینی پڑتی ہے کیوں کہ دین کی حفاظت جان کی حفاظت سے زیادہ اہم ہے (مستفاد از اسلامی شریعت کا عمومی نظریہ ۱۲۱/)۔

خلاصہ:

خلاصہ یہ کہ اصول یہ ہے کہ ہر تکملہ کے لئے بحیثیت تکملہ ایک شرط ہے، اور وہ یہ کہ اس کا اعتبار اس طور پر نہ ہو کہ اصل ہی باطل ہوجائے (الموافقات ۳/۲)۔

امام شاطبی کے حوالے سے احمد الریسونی نے اس کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ معاملات میں اس کی مثال بیع ہے، کہ بیع کی صحت کے لئے غرر کا نہ پایا جانا شرط ہے، لیکن اس شرط کا وجود بعض بیوع میں ناممکن یا نہایت مشکل ہوجاتا ہے، بالخصوص پورے طور پر ''غرر'' کا ازالہ نہایت دشوار ہوجاتا ہے، اس وقت ہم دو اختیار کے درمیان ہوتے ہیں، یا تو ان بیوع کو باطل قرار دیں جن میں تھوڑا بہت غرر پایا جارہا ہے یا پھر ان بیوع کو نافذ کردیں، اور ممکن حد تک غرر کو کم کرنے کی کوشش کریں (نظریہ مقاصد امام شاطبی کے نزدیک ۱۷۴/۔۱۷۵)۔

باب دوم:

معاملات کی اہمیت

دین اسلام اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے احکامات پر مبنی وہ نظام حیات ہے جو ہر اعتبار سے کامل ومکمل ہے اور انسانی زندگی کے شعبے کی ضروریات کے متعلق بہترین راہنمائی کرتا ہے، اس میں انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی وبین الاقوامی زندگی کے ہر گوشے کے بارے میں مکمل راہنمائی موجود ہے، یہی نہیں بلکہ اسلامی قوانین انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک پورے معاشرے کے وجود کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

شریعت نے جس طرح عقائد وعبادات کے بارے میں جزئیات واحکام بیان کئے ہیں، اسی طرح شریعت اسلامی نے معاملات کی تفصیل بھی بیان کرنے کا اہتمام کیا ہے۔ حلال وحرام، مکروہ اور غیر مکروہ اور جائز وطیب مال کے مکمل احکام قرآن وحدیث میں موجود ہیں اور شریعت کے دیگر جزئیات کی طرح اس میں بھی مکمل راہنمائی کی گئی ہے۔

بقول مشہور مالکی فقیہ اور مفسر قرآن علامہ ابن العربی: ''انسانی ترقی کا دار ومدار یا انسان کی بقا کا دار ومدار جن معاملات پر ہے ان میں عقد نکاح، عقد بیع دو بنیادی اہمیت رکھنے والے معاملات ہیں، اس لئے وہ لکھتے ہیں : ''**یتعلق بهما أقوام العالم**''، دنیا کی پوری زندگی کی بقا ان دونوں پر موقوف ہے۔ جہاں عقد بیع غذا اور ضروریات زندگی کے لئے ضروری ہے، وہیں عقد نکاح تسلسل نوعی (نسلِ انسانی) کے لئے ضروری ہے، اس لئے شریعت نے ان دونوں معاملات کے متعلق بہت تفصیلی احکام بتائے ہیں، یہی وجہ ہے کہ فقہائے اسلام نے فقہ العبادات اور فقہ المناکحات یعنی احوال شخصیہ کے احکام ومسائل کے بعد سب سے اہم درجہ فقہ المعاملات کو قرار دیا ہے۔

معاملات ہی پر تمام تر تجارت، تمام لین دین، تمام معاشی سرگرمیوں اور انسان کی پوری اقتصادی زندگی کا دار ومدار ہے، مطلب یہ کہ اس پوری زندگی کے احکام فقہائے اسلام نے اسلامی فقہ کے جس باب اور جس شعبے میں مرتب کئے ہیں وہ فقہ المعاملات کہلاتا ہے، اس لئے عبادات ومناکحات کے بعد فقہ اسلامی کا انتہائی اہم اور ناگزیر حصہ فقہ المعاملات کا ہے۔

اسی لئے معاملات کی تعریف بھی یہ کی جاتی ہے کہ سماج کے دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان باہمی احتیاج وضرورت کی بنا پر جو مالی تعلق قائم ہوتا ہے اسی کو فقہ وقانون کی زبان میں ''معاملہ'' کہتے ہیں۔

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب لکھتے ہیں:

''معاملات دین کا بہت اہم شعبہ ہے، جیسے اللہ نے ہمیں عبادات کا مکلف بنایا ہے اسی طرح معاملات کا بھی مکلف بنایا ہے۔ اور جس طرح ہمیں عبادات میں رہنمائی عطا فرمائی ہے اسی طرح معاملات میں بھی رہنمائی عطا فرمائی ہے کہ ہم آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لین دن کے وقت کن باتوں کا خیال رکھیں، کون سی چیزیں حلال ہیں؟ اور کون سی چیزیں حرام ہیں؟ افسوس یہ ہے کہ ایک عرصۂ دراز سے مسلمانوں کے درمیان معاملات سے متعلق جو شرعی احکام ہیں، ان کی اہمیت دلوں سے مٹ گئی ہے۔ دین صرف عقائد وعبادات کا نام رکھ دیا ہے، معاملات کی صفائی، معاملات میں جائز وناجائز کی فکر اور حلال وحرام کی فکر رفتہ رفتہ ختم ہوگئی ہے، اسی لئے اس کی اہمیت زیادہ ہے کہ ان کے بارے میں غفلت بڑھتی جارہی ہے'' (اسلام اور جدید معاشیات)۔

صحابۂ کرامؓ نے کبھی تجارت کو دین سے الگ نہیں سمجھا بلکہ وہ دونوں کو ساتھ لے کر چلتے تھے، وہ دین کو مقصد اور کاروبار کو اس کا وسیلہ سمجھتے تھے، علامہ قرطبیؒ نے ایک روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں دو صحابی تھے، ایک تجارت کرتے تھے، دوسرے تلواریں بنا کر بیچا کرتے تھے، پہلے صحابی کی تجارت کا یہ حال تھا کہ اگر سودا تولتے وقت

اذان کی آواز کان میں پڑ جاتی تو وہیں ترازو کو چھوڑ کر نماز کے لئے چل پڑتے جب کہ دوسرے صحابی کا دستور یہ تھا کہ گرم لوہے پر ہتھوڑے کی ضرب لگا رہے ہیں اور کان میں اذان کی آواز آ گئی تو اگر ہتھوڑا کندھے پر اٹھائے ہوئے ہیں تو وہیں کندھے کے پیچھے ہتھوڑا ڈال کر نماز کے لئے چل دیتے تھے، اٹھائے ہوئے ہتھوڑے کی ضرب سے کام لینا بھی گوارا نہ کرتے تھے (معارف القرآن بحوالہ قرطبی ۶/ ۴۳۰)۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے کرام نے تجارتی معاملات پر زیادہ کام کیا ہے۔

تجارتی معاملات کی اہمیت اس سے بھی عیاں ہوتی ہے کہ یہ ہر مرد وعورت، ہر دکاندار، ہر تاجر اور ہر بازار کی ضرورت ہے، کسی ملک وقوم کی ترقی میں صنعت وتجارت کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کتب فقہ میں کاروباری معاملات پر منقسم ابواب کا حجم دیگر معاملات سے بہت زیادہ ہے۔

مالی معاملات میں کمزوری کے نقصانات:

مالی معاملات میں کمزوری کی وجہ سے عبادات بھی قبول نہیں ہوتیں، چنانچہ ایک حدیث کے مطابق جو صدقہ حرام مال سے کیا جائے وہ قبول نہیں ہوتا (سنن نسائی، حدیث نمبر: ۲۵۲۶)۔

ایک اور حدیث کے مطابق اس شخص کی دعا قبول نہیں ہوتی جس کا کھانا پینا حرام مال سے ہو (صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۲۳۴۶)، جب پیٹ میں حرام جاتا ہے تو اس سے اور بھی کئی جسمانی اور روحانی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ انسان کے قدم قیامت کے دن اس وقت تک اٹھ نہیں سکیں گے جب تک وہ پانچ سوالوں کے جوابات نہ دے دے، ان میں سے دو سوال کمانے اور خرچ کرنے سے متعلق ہیں کہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ (سنن دارمی، حدیث نمبر: ۵۵۶)، لہذا ایک مسلمان کے مال کمانے اور خرچ کرنے میں احتیاط ہی آخرت کی جواب دہی سے بچا سکتی ہے۔

تجارت دین سے جدا نہیں:

تاریخ کے اوراق میں یہ بات محفوظ ہے کہ یہود ونصاریٰ کی ہلاکت و بربادی ان کے دین میں بگاڑ اور تبدیلی پیدا ہونے کی ایک وجہ یہ بنی تھی کہ انہوں نے دین اور دنیا کو دو الگ الگ چیزیں سمجھنا شروع کر دیا تھا، وہ خود کو کلیساؤں کی حد تک مذہب کا پابند سمجھتے تھے اور اس سے باہر کے تمام کاروبار اور امور زندگی میں خود کو آزاد تصور کرتے تھے، موجودہ دور کی اصطلاح میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ سیکولر ہو گئے تھے، وہ مذہب کو اپنا نجی اور ذاتی مسئلہ قرار دیتے اور دنیوی معاملات میں زمانے کے طور طریقوں پر چلتے، مثلاً آسمانی صحیفوں میں سود کو حرام قرار دیا گیا تھا، اس کے باوجود انہوں نے اپنے کاروبار میں سودی معاملات کو داخل کرلیا اور مال ودولت جمع کرنے کے اس قدر حریص ہو گئے کہ اس کے لئے انہوں نے جائز ناجائز کسی چیز کی پرواہ نہیں کی، المیہ یہ ہے کہ آج مسلمانوں کے بازار بھی تقریباً اسی خطرناک صورت حال سے دوچار ہیں، ہم کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں کہ لوگ اپنے معاملات (Business) میں شریعت کے احکام کو یکسر نظر انداز کر رہے ہیں اور زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کی حرص میں حلال وحرام کی تمیز ختم ہوتی جارہی ہے، یہ بالکل وہی صورت حال ہے جس کی طرف ایک حدیث مبارکہ میں اشارہ کیا گیا ہے: ''میری امت پر ایک زمانہ آئے گا کہ آدمی کو یہ پرواہ نہ ہوگی کہ وہ جو کمارہا ہے وہ حلال ہے یا حرام'' (الترغیب والترہیب ۲/ ۳۴۷)۔

معاملات کو دین سے الگ سمجھنے کا ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ معاشرے سے حلال وحرام کی تمیز اٹھ جاتی ہے، حلال وحرام کی تمیز اٹھ جانے کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ معاشرے میں حرام اور گندے مال کی بہتات ہوجاتی ہے۔ ظاہر ہے جس معاشرے میں حرام اور ناجائز مال کی کثرت ہوجائے، وہ معاشرہ قحط سالی، بے روزگاری، مہنگائی، حکومتی نااہلی، خانہ جنگی، موذی امراض اور حادثات کا شکار ہوجاتا ہے، پھر نیک لوگ دعائیں کریں تب بھی دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

وقت کی اہم ضرورت:

ان حالات میں علماء اور تاجر برادری کا مل بیٹھنا اور بازاروں سے ناجائز معاملات کے خاتمہ کے لئے مل جل کر کوششیں کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے، اس ضرورت کی تکمیل اسی وقت ہوسکتی ہے جب تاجر اور صنعت کار حضرات اپنے معاملات کی تفصیل سے علماء کرام کو آگاہ کریں اور علماء کرام دی گئی معلومات کا شرعی جائزہ لے کر ان کو درست راہنمائی فراہم کریں، تاجر حضرات کو تجارت کے احکام سے واقف کرایا جائے، جو معاملات پیچیدہ ہوں ان پر غور وخوض کر کے ان کا متبادل حل تلاش کیا جائے، تاجر برادری کو مستند علماء کرام تک رسائی فراہم کی جائے اور ان کے معاملات کو ترجیحی بنیادوں پر نمٹانے کی کوشش کی جائے۔

حکمتوں اور مصالح پر احکام شریعت کی بنیاد:

شریعت کے تمام ہدایات وضوابط مقصدی واقع ہوئے ہیں اور شریعت کے مقصود کو جامع طور پر انسان کے تزکیہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ شریعت کی وضع وترتیب کا شرعی مقصود یہ ہے کہ مکلف کو اپنی خواہشات کی بندگی سے نکالا جائے تا کہ جس طرح وہ اضطراری طور پر اللہ کا بندہ ہے، اسی طرح اختیاری طور پر بھی اس کا بندہ بن جائے۔ شریعت کا ایک اہم مقصد انسانوں کا تزکیہ ہے؛ کیونکہ یہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد رہا ہے، نیز تزکیہ کے پہلو بہ پہلو شریعت کا یہ بھی مقصد رہا ہے کہ انسانی زندگی قائم رہے، خوش اسلوبی اور سہولت کے ساتھ زندگی گزاری جاسکے، اور دنیا میں اسے ایسی فلاح نصیب ہو جو فلاح آخرت کا پیش خیمہ ثابت ہو۔ مفکرین اسلام اس بات پر متفق ہیں کہ شریعت کا مقصد انسانی مفادات کا تحفظ اور اس کے مصالح کا حصول ہے۔

''لہذا تمام احکام میں شریعت کی بنا حکمتوں پر رکھی گئی ہے، اور معاش ومعاد میں اصل توجہ انسانی مصالح کی طرف ہے، شریعت سراسر عدل، مجسم رحمت اور سرتا پا حکمت ومصلحت پر مبنی ہے، دنیا وآخرت دونوں میں فلاح وسعادت اس سے وابستہ ہے'' (محمد بن قیم الجوزیہ: اعلام الموقعین ۳/۱)۔

احادیث معاملات پر اگر ہم طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ قرآن واحادیث نے معاملات کے تعلق سے چند ایسے بنیادی اصول دیئے ہیں جو شریعت کا منشا ومقصود ہے اور جن کی پیروی کرنا ہم پر لازم ہے۔ یہ وہ اصول ہیں جو ہر کاروبار یا لین دین میں موجود ہونے چاہئیں، اگر ان کی خلاف ورزی ہوگی تو کاروبار یا لین دین جائز نہیں ہوگا، نیز ان میں سے بعض اصول تو وہ ہیں جنھیں فقہاء نے بیع کے شرائط کے طور پر ذکر کیا ہے۔

جیسے کہ تراضی یا رضامندی، دفع ظلم، ظلم کو دور کرنا اور مکمل عدل وانصاف کا پایا جانا، اسی طریقے سے ایک اصول ''سد ذریعہ'' ہے، یعنی کسی برے ذریعہ کا سد باب کرنا، اسی طریقے سے دولت کا گردش میں رہنا، جس میں احتکار کی ممانعت آئی ہے، رفع حرج، یسر وآسانی، دفع مشقت اور لوگوں کی مصلحت کا لحاظ وغیرہ۔

مثال کے طور پر اگر تراضی کی بات کریں جس کو قرآن مجید نے بھی بیان فرمایا ہے:

''لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل إلا أن تكون تجارة عن تراض منكم'' (سورہ نساء:۲۹)

یہاں قرآن مجید نے تراضی کی اصطلاح استعمال کی ہے، کہ جب تجارت ہو، لین دین ہو، تو وہ آپس کی مکمل رضامندی سے ہو، جب تک فریقین کی طرف سے مکمل رضامندی نہ ہو اس وقت تک تجارت جائز نہیں ہے۔ اب اسی اصول کی مزید وضاحت ہمیں متعدد احادیث رسول ﷺ میں بھی مل جائے گی، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کے نتیجے میں تراضی کی شرط مجروح ہو رہی ہو وہ عقد کے جواز کو متاثر کردے گا مثال کے طور پر فقہاء نے اکراہ (زور زبردستی) کو تراضی کے منافی قرار دیا ہے یعنی جبر اور زور زبردستی سے کسی شخص نے کسی چیز کو اونے پونے داموں میں خریداری کی تو اس سے بیع فاسد ہوجائے گی اور شریعت کا مقصد اس سے فوت ہوجائے گا کیوں کہ یہ مشتری یا بائع کے ساتھ ایک طرح کا استحصال اور اسے دھوکہ دینا ہوگا، اسی لئے فقہاء نے کہا کہ ہر وہ رضامندی جو کسی غلط طریقے یا غلط بیانی سے (جس کو تدلیس بھی کہا جاتا ہے) حاصل کی گئی ہو (جس کی وضاحت احادیث میں موجود ہے) وہ رضامندی ناقابل

قبول ہے اور اس کے نتیجے میں جو بیع ہوگی وہ فاسد ہوگی۔

لہذا قرآن کریم میں جو تراضی کا اصول دیا گیا ہے اس کا عملی تقاضا بھی یہی ہے کہ کسی طرح کا کوئی دھوکہ نہ ہو، فریب نہ ہو، واضح طور پر ہر خرید وفروخت ایجاب وقبول کی بنیاد پر ہو اور ہر ایک بیچی یا خریدی ہوئی چیز پر ایجاب وقبول پایا جائے اور مکمل ملکیت پائی جائے تا کہ تراضی کا اصول مجروح نہ ہو، لیکن دوسری طرف معاملات میں اگر تراضی کا اصول مجروح نہ ہو رہا ہو، مثلاً متعاقدین باہم راضی ہوں، کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو، جس کی مثال فقہاء نے بیع التعاطی کی دی ہے جو بیع عرف ورواج پر مبنی ہے اور عرف ورواج یہ ہے کہ جن چیزوں کی قیمتیں ایک دام کے طور پر متعین ہوتی ہیں، خریدنے والا آتا ہے، رقم رکھتا ہے اور سامان اٹھا کر چلا جاتا ہے، نہ دوکاندار خریدار سے کچھ کہتا ہے اور نہ خریدار دوکاندار سے کچھ بولتا ہے، لیکن چونکہ یہ بیع فریقین کی باہمی رضامندی سے ہو رہی ہے اس لئے فقہاء نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

اسی طرح رفع ظلم، ظلم کو دور کرنا بھی شریعت کا اور خود مقاصد شرعیہ کا ایک اہم رکن اور اصول ہے یعنی کسی بھی تجارت اور لین دین میں کسی فریق پر کسی طرح کا ظلم نہیں ہونا چاہئے، مثال کے طور پر اگر کوئی کسی سے کوئی چیز خریدے، لیکن بائع یہ شرط لگادے کہ آپ خرید تو لیے ہیں لیکن اس کے استعمال کا حق صرف مجھے ہے تمھیں نہیں، ظاہر ہے یہ بیع نہیں ہے اور نہ شریعت میں ایسا معاملہ جائز ہے بلکہ شریعت کی نظر میں یہ ظلم ہے، لہذا ایسی کوئی شرط جس میں کسی ایک فریق کو ایسا فائدہ حاصل ہو جو عام طور پر تاجروں کے رواج کے مطابق اس فریق کو نہیں ملنا چاہئے اور وہ اپنے لئے وہ منافع لینا چاہتا ہے تو ایسی خرید وفروخت جائز نہیں ہوگی کیوں کہ ایک تو یہ ظلم ہے اور دوسرے شریعت کے مقاصد کے بھی خلاف ہے۔

مطلب یہ کہ شریعت نے جتنے احکام دیئے ہیں یا جتنے محرمات قرآن واحادیث میں بیان فرمائے ہیں وہ اور جن جن چیزوں کی مسلمانوں سے توقع کی جاسکتی ہے وہ تمام کے تمام ایسے امور ہیں جن کی بنیاد انسانوں کی مصلحتوں اور انسانوں کے فائدے پر ہے۔ ''**المعاملات تبنی علی**

مراعات العلل والمصالح'' جن چیزوں کو شریعت نے مصلحت قرار دیا ہے یا جو چیزیں ان دونوں کے مصالح ومفاد سے مطابقت رکھتی ہیں اور شریعت کے کسی احکام یا منشا ومقصود سے متعارض نہیں ہیں تو ان کا لحاظ معاملات میں رکھنا چاہئے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ شریعت کی رو سے پسندیدہ بھی ہے، جیسے عامۃ الناس کی جان ومال کو محفوظ رکھنے اور ان کی حفاظت کرنے والے معاملات، عامۃ الناس کو تحفظ فراہم کرنے والے معاملات یا عامۃ الناس کے لئے وسائل رزق مہیا کرنے والے معاملات، عامۃ الناس کی زندگیوں میں سہولتیں پیدا کرنے والے معاملات یا اسی طرح لوگوں کے معیار زندگی کو جائز حدود کے اندر بہتر بنانے والے معاملات، ان سب کی رعایت، تجارت اور کاروبار کے طور طریقوں میں رکھی جائے گی اور کوئی ایسا کاروبار کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی جن سے ان مقاصد کے راستے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہو۔

معاشی معاملات میں شریعت کے مقاصد:

معاشیات کے میدان میں اسلامی شریعت کے مقاصد کا خلاصہ درج ذیل ہے:

۱۔ تمام بنی نوع انسان کے فائدے کے لئے اس کی تعمیر نو اور اصلاح کر کے انھیں زمین کا جانشیں اور بااختیار بنانا۔

۲۔ معاشی، سماجی، ثقافتی اور فکری طور پر انسان اور معاشرے کی جامع ترقی کا حصول۔

۳۔ مال کی حفاظت کرنا، سرمایہ کاری کے ذریعہ اس کو ترقی دینا، معاہدوں میں مالوں کا تبادلہ کرنا، اس کے ضیاع کا جائزہ لینا اور استعمال میں اس طرح اعتدال اختیار کرنا جو فضول خرچی، کنجوسی اور بخل سے مبرا ہو، کیونکہ پیسہ معاشرے کی بنیاد ہے۔

اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا :''**ولا تؤتوا السفهاء أموالكم التي جعل الله لكم قياماً**'' (سورہ نساء: ۵) (تم بے وقوفوں کو اپنا مال نہ دو جس کو خدا نے تمہارے لئے قیام وبقا کا ذریعہ بنایا ہے)۔

۴۔ اسلامی معاشرے اور پھر انسانی معاشرہ کے اندر اپنے سماجی اور علامتی کردار کی

انجام دہی میں مال ودولت کے پیغام کو حاصل کرنا کہ مال اللہ کا ہے اور انسان کو اس کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس لئے اسے وہ کام کرنا چاہئے جو مال کے مالک نے خرچ کرنے اور خاندانی اور سماجی یکجہتی کے حوالہ سے حکم دیا ہے۔

اسلامی تصور مال:

اسلام مال کے ضمن میں واضح تعلیمات وہدایات پیش کرتا ہے، ذیل میں اس کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

مال ودولت کی اہمیت قرآن وحدیث کی روشنی میں:

مال ودولت اس لیے ضروری ہے کیوں کہ اگر انسان کی معاش متاثر ہو اور وہ فقر وفاقہ کا شکار ہوجائے تو اس کا معاملہ کفر تک جا پہنچتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے

''فقر انسان کو کفر تک پہنچا دیتا ہے''۔

مزید یہ کہ اگر انسان کو مادی وسائل دستیاب نہ ہوں تو اس کے لیے دینی تقاضوں کی انجام دہی بھی بعض حالات میں انتہائی مشکل اور کبھی کبھی بالکل ناممکن ہوجاتی ہے، اس لیے قرآن کریم نے جہاں انسان کی خالص دینی اور روحانی ذمہ داریوں کو یاد دلایا ہے وہیں اس کی معاشی ضروریات اور تقاضوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے، اس لیے کہ وہ اپنے روحانی معاملات، دینی ذمہ داریوں اور اخلاقی تقاضوں کی کماحقہ تکمیل اسی وقت کرسکتا ہے جب اس کو بقدر ضرورت مادی وسائل اور اسباب میسر ہوں۔

قرآن حکیم نے مال و دولت کو انسانی زندگی کے قیام کا ذریعہ بتایا ہے، چنانچہ اس نے حکم دیا ہے کہ اپنا مال کم عقلوں کو مت دو ورنہ وہ اسے ضائع کردیں گے

''وَلاَ تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِيْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَاماً'' (النساء:۵)۔

(اور اپنے وہ مال جنہیں اللہ نے تمہارے لیے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے نادان

لوگوں کے حوالے نہ کرو)۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

"فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِيْ الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللهِ" (الجمعہ:۱۰)۔(پھر جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو)۔

یہ تمام آیات مال و دولت کمانے اور معاشی جدو جہد کرنے کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔

اسی طرح متعدد احادیث میں کسب مال کی فضیلت بیان کی گئی ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: "نعم المال الصالح للرجل الصالح" (بخاری؛ الادب المفرد)۔ (اچھا مال اچھے انسان کے لیے ہے)۔

ایک موقع پر اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے خادم خاص حضرت انسؓ کو یہ دعا دی' "اللهم أكثر ماله" (الکسب الطیب وتربیتہا ر۱۰۵، حدیث: ۳۶۵)۔(اے اللہ! اس کے مال میں خوب اضافہ کردے)۔

اسی طرح آپؐ نے ایک موقع پر اپنے رفیقِ خاص ساتھی حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: "مجھے ابوبکر کے مال کی طرح کسی کے مال نے فائدہ نہیں پہنچایا"۔

خلفائے راشدین اور دیگر صحابہ کرام کی زندگیوں پر جب ہم نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جہاں میدان جہاد کے غازی تھے، وہیں معاشی جدو جہد اور کسبِ مال کو بھی ضروری سمجھتے تھے، چنانچہ عشرہ مبشرہ میں سے حضرت عبد الرحمن بن عوفؓ، حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت زبیر بن العوامؓ آج کے ارب پتیوں سے زیادہ مال دار تھے، یہ حضرات جنگ کے مواقع پر مالی تعاون پیش کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے اور دوسرے مواقع پر بھی مسلمانوں کو خوب مالی امداد کیا کرتے تھے۔

قرآن مجید میں مال کمانے اور اسے خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''فَكُلُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلالاً طَيِّباً وَاشْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ''
(النحل: ۱۱۴)۔

(پس اے لوگو! اللہ نے جو کچھ حلال اور پاک رزق تم کو بخشا ہے اسے کھاؤ اور اللہ کے احسان کا شکر ادا کرو، اگر تم واقعی اسی کی بندگی کرنے والے ہو)۔

''يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ'' (البقرہ: ۲۶۷)۔

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! جو مال تم نے کمائے ہیں اس میں سے بہتر حصہ راہِ خدا میں خرچ کرو)۔

ایک اور جگہ ہے:

''وَآتُوهُم مِّن مَّالِ اللّٰهِ الَّذِي آتَاكُمْ'' (النور: ۳۳)۔

(اور ان (مملوکوں) کو اس مال میں سے دو جو اللہ نے تمہیں دیا ہے)۔

ظاہر ہے کہ جس شخص کے پاس پیسے ہوں گے وہی خرچ کر سکتا ہے اور جو صاحب نصاب ہوگا وہی زکوۃ سے دوسروں کی مدد کر سکتا ہے۔

مال کب آزمائش بنتا ہے؟

اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے مال کی محبت فطری طور پر انسان میں ودیعت کی ہے، قرآن کریم میں جگہ جگہ اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، مثلاً ''اِنَّهٗ لِحُبِّ الخَيْرِ لَشَدِيْدٌ'' (العادیات: ۸) (اور وہ (انسان) مال و دولت کی محبت میں بری طرح مبتلا ہے)، اسی طرح فرمایا گیا: ''وَتُحِبُّوْنَ المَالَ حُبًّا جَمًّا'' (الفجر: ۲۰) (اور تم مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو)، ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِندَ رَبِّكَ ثَوَاباً وَخَيْرٌ أَمَلاً'' (الکہف: ۴۶)۔

(یہ مال اور یہ اولاد محض دنیوی زندگی کی ایک ہنگامی آرائش ہے، اصل میں تو باقی رہ

جانے والی نیکیاں ہی تیرے رب کے نزدیک نتیجے کے لحاظ سے بہتر ہیں اور انہی سے اچھی امیدیں وابستہ کی جاسکتی ہیں)۔

لیکن اگر مال کی محبت حدود کے اندر ہے اور وہ انسان کی بڑی ذمہ داریوں کو فراموش کرنے کا سبب نہیں بن رہی ہے تو اس کے حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر اس کی محبت بڑھ جائے اور حدود سے نکل جائے تو پھر یہ ناپسندیدہ ہے، اسی لیے قرآن مجید میں مال کو فتنہ (وجہ آزمائش) بھی فرمایا گیا ہے: "وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ" (الأنفال: ۲۸) (اور جان رکھو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد حقیقت میں سامان آزمائش ہیں)، دوسری جگہ ہے: "وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ الَّذِىْ جَمَعَ مَالاً وَعَدَّدَهُ، يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَه" (الماعون: ۱۔۳) (تباہی ہے ہر اس شخص کے لیے جو (منہ در منہ) لوگوں پر طعن اور (پیٹھ پیچھے) برائیاں کرنے کا خوگر ہے، جس نے مال جمع کیا اور اسے گن گن کر رکھا، وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا)۔

جائز طریقے سے مال حاصل کرنا کوئی گناہ نہیں ہے لیکن اس کی ایسی محبت کہ ہر وقت انسان اسی کی گنتی میں لگا رہے، اسے گناہ پر آمادہ کر دیتی ہے، جب کسی پر مال کی محبت اس طرح سوار ہو جائے تو وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ میری ہر مشکل اسی کے ذریعہ آسان ہوگی، چنانچہ وہ موت سے غافل ہو کر دنیاداری کے منصوبے بناتا رہتا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے یہ مال اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا، پھر ایسا شخص اپنی وہ دینی ذمہ داریاں انجام نہیں دیتا جو اللہ تعالیٰ نے اس پر عائد کر رکھی ہیں، اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتا، جس کی اسے تلقین کی گئی ہے، زکوٰۃ نہیں ادا کرتا اور نفقات واجبہ کے تقاضے پورے نہیں کرتا، ایسے لوگوں کو قرآن کریم میں دردناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے۔

اسلام اپنے متبعین کو جہاں مال و دولت جمع کرنے کی اجازت دیتا ہے اور دنیاوی فائدے حاصل کرنے کا شوق دلاتا ہے وہیں اسلام نے اس کے مصارف بھی بتا دیا ہے تا کہ

کوئی نقص واقع نہ ہونے پائے، مال داری مسلمانوں کے لیے ایک ایسی آزمائش ہے جہاں اچھے اچھے راسخ العقیدہ لوگوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔

مال و دولت دین و دنیا دونوں کے لیے ضروری ہے:

دوسری طرف مال و دولت کی انسانی معاشرے کے لیے وہی حیثیت ہے جو انسانی جسم کے لیے خون کی ہے، جس طرح انسانی زندگی خون کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، اسی طرح کوئی معاشرہ معاشی سرگرمی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا، اس بنا پر مال حاصل کرنا اور دولت کمانا کوئی بری بات نہیں ہے بلکہ وہ انسانی معاشرے کی ناگزیر ضرورت ہے اور فرد اور معاشرہ دونوں کے وجود و بقا کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، البتہ دولت کو پا کر اترانا، اللہ کو بھول جانا اور اس کے بندوں کے حقوق ادا نہ کرنا ناپسندیدہ اور بُری بات ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"وَابْتَغِ فِيمَآ آتَىٰكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَأَحْسِن كَمَا أَحْسَنَ اللّٰهُ إِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْأَرْضِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ" (القصص: ۷۷) (جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصہ فراموش نہ کر۔ احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر، اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا)۔

اس آیت کی تشریح میں مولانا مفتی محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں:

"مطلب یہ ہے کہ مال و دولت کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق استعمال کرو جس کے نتیجے میں آخرت کا ثواب حاصل ہو، آخرت کا گھر بنانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا کی ضروریات بالکل نظر انداز کر دو بلکہ ضرورت کے مطابق دنیا کا ساز و سامان رکھنے اور کمانے میں بھی کچھ گناہ نہیں ہے، البتہ دنیا اس انداز سے نہ کماؤ جس سے آخرت میں نقصان اٹھانا پڑے۔ یہاں اشارہ فرما دیا گیا کہ جو مال و دولت تمہیں دنیا میں ملا ہے حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور اس نے تم پر احسان کر کے تمھیں عطا فرمایا ہے، اسی طرح تم بھی لوگوں پر احسان کر کے

انہیں اس مال و دولت میں شریک کرو'' (آسان ترجمہ قرآن مفتی تقی عثمانی)۔

سب سے اہم اصول جس کا نبی ﷺ نے اعلان کیا ہے جسے بخاری نے روایت کیا ہے کہ ''اپنے اہل وعیال کے لیے مال چھوڑ کر مرنا اس سے بہتر ہے کہ آدمی ان کو مفلس اور بے سہارا چھوڑ کر مرے'' (شرح بلوغ المرام، حدیث: ۲۵)۔

علامہ قرطبیؒ اپنی تفسیر میں ایک جگہ لکھتے ہیں : ''بعض کم علم لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ ضرورت سے زائد مال جمع کرنا توکّل کے منافی اور گناہ ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جائز طریقے سے نیک نیتی کے ساتھ ضرورت سے زائد مال جمع کرنا نہ صرف جائز بلکہ ثواب کا کام ہے، البتہ اگر مال جمع کرنے اور بچت کرنے کا مقصد ٹھیک نہ ہو، مثلاً کوئی شخص نمائش، نام و نمود، حبِّ جاہ اور حبِّ مال کی وجہ سے مال جمع کرنا چاہتا ہو، یا غلط جگہوں پر خرچ کرنا چاہتا ہو تو یہ غلط اور گناہ کا سبب ہوگا۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے ''زیادہ مال رکھنے والے قیامت کے روز خسارے میں ہوں گے مگر جنہوں نے اس طرح اور اس طرح (صدقہ وخیرات میں خرچ) کیا'' (بخاری، ترمذی: ۶۱۷)۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ وَأَمْدَدْنَاكُم بِأَمْوَالٍ وَبَنِينَ وَجَعَلْنَاكُمْ أَكْثَرَ نَفِيراً'' (الاسراء: ۶)۔

(اس کے بعد ہم نے تمہیں ان پر غلبے کا موقع دے دیا اور تمہیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی)۔

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر انسانوں کو اس کا فضل حاصل کرنے یعنی مال کمانے کی ترغیب دی ہے، اگر مال کمانا جائز نہ ہوتا تو مسلمانوں کو زکوۃ کا حکم بھی نہ دیا جاتا، اس کے علاوہ حج، صدقات وخیرات، مہر اور وراثت وغیرہ سے متعلق بہت سے احکام ومسائل ہیں جن کے لیے مال و دولت کی ضرورت پڑتی ہے، اگر مال و دولت

رکھنا مسلمانوں کے لیے جائز نہ ہوتا تو اس قسم کے احکام بھی نہ دیے جاتے۔

ایک حدیث قدسی میں مال کا بنیادی مصرف واضح کیا گیا ہے کہ:

"إنّا أنزلنا المالَ لإقامِ الصلاۃ وإیتاءِ الزکاۃ" (سلسلۃ الصحیحۃ للالبانی، ص رقم ۱۶۳۹)

(ہم نے مال نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے نازل کیا ہے)۔

اقامت صلوٰۃ سے اللہ کے حقوق اور ادائیگی زکوٰۃ سے بندوں کے حقوق کی طرف اشارہ ہے، گویا اس میں حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں شامل ہیں۔

ایک دوسری حدیث میں جو حضرت عبداللہ بن عمروؓ سے مروی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"کُلُوا وَ اشْرَبُوا وَ الْبَسُوا وَ تَصَدَّقُوا فِي غَيْرِ إسْرَافٍ وَ لَا مَخِيلَةٍ" (صحیح ابن ماجہ، رقم: ۲۷۲۰، نسائی: ۲۵۵۹) (کھاؤ پیو، پہنو اور صدقہ کرو، جب تک اس میں فضول خرچی یا تکبر کی آمیزش نہ ہو)۔

اسی طرح دوسری حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا

"جو شخص اللہ تعالیٰ سے تھوڑے رزق پر راضی رہتا ہے اللہ اس کے تھوڑے عمل سے راضی ہو جاتا ہے" (رواہ البیہقی فی شعب الایمان ۵/ ۶۴)۔

ایک حدیث ہے جس میں حضرت کعب بن عجرہؓ فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ کے پاس سے ایک آدمی گزرا صحابہ نے دیکھا کہ وہ روزی کے حصول میں بہت متحرک ہے اور پوری دل چسپی لے رہا ہے وہاں بیٹھے ہوئے بعض اصحاب نے کہا اے اللہ کے رسول! اگر اس کی دوڑ دھوپ اور دل چسپی اللہ کی راہ میں ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا، اس پر آپؐ نے فرمایا اگر وہ اپنے چھوٹے بچوں کی پرورش کے لیے دوڑ دھوپ کر رہا ہے تو یہ اللہ کی راہ میں شمار ہوگی، اگر وہ اپنے بوڑھے والدین کی کفالت کے لیے کوشش کر رہا ہے تو یہ بھی اللہ کی راہ میں شمار ہوگی اور اگر اپنی ذات کے لیے کوشش کر رہا ہے اور مقصد یہ ہے کہ وہ لوگوں کے آگے ہاتھ

پھیلانے سے بچا رہے تو یہ کوشش بھی اللہ کی راہ میں شمار ہوگی، البتہ اگر اس کی محنت اور کوشش زیادہ مال حاصل کر کے لوگوں پر برتری جتانے اور ان کے سامنے دکھاوا کرنے کے لیے ہو تو پھر اس کی یہ ساری کوشش اور جدوجہد شیطان کی راہ میں شمار ہوگی'' (طبرانی: ۵۴۹۶، صححہ الالبانی)۔

۱۔تمام مال ملکیت الٰہیہ ہے:

قرآن مجید نے قطعی طور پر اس حقیقت کو آشکارا کیا ہے کہ زمین و آسمان میں جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ کا تخلیق کردہ ہے، وہی ہے، جو ان کے نظام سے واقف ہے اور احسن طریقے سے اس نظام کو چلا رہا ہے، لہذا وہی ان کا مالک حقیقی ہے، ارشاد باری تعالی ہے:

''**لله ما في السموات وما في الأرض وإن تبدوا ما في أنفسكم أو تخفوه يحاسبكم به الله فيغفر لمن يشاء ويعذب من يشاء والله على كل شيئ قدير**'' (سورۃ البقرہ: ۲۸۴) (جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اللہ کے لئے ہے، اور وہ باتیں جو تمہارے دلوں میں ہیں، خواہ انہیں ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تم سے اس کا حساب لے گا، پھر جسے وہ چاہے گا بخش دے گا اور جسے چاہے گا عذاب دے گا، اور اللہ ہر چیز پر کامل قدرت رکھتا ہے)۔

اسی طرح فرمایا :''**ألم تعلم أن الله له ملك السموات والأرض**'' (سورۃ البقرہ: ۱۰۷) (کیا تمھیں معلوم نہیں کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اللہ ہی کے لئے ہے)۔

اور پھر فیصلہ کر دیا :''**وله الدين واصبا أفغير الله تتقون، وما بكم من نعمة فمن الله ثم إذا مسكم الضر فإليه تجئرون**'' (سورۃ النحل: ۵۲۔۵۳) (اور جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، سب اسی کا ہے اور سب کے لئے اس کی فرمانبرداری واجب ہے، تو کیا تم غیر خدا سے ڈرتے ہو؟ اور تمھیں جو نعمت بھی حاصل ہے، سو وہ اللہ ہی کی جانب سے ہے، پھر جب تمھیں تکلیف پہنچتی ہے تو تم اسی کے آگے گریہ وزاری کرتے ہو)۔

سورۃ النحل میں استفہامیہ انداز اختیار کرتے ہوئے اللہ تعالی نے اپنی خالقیت، تمام

مخلوقات، زمین اور اس کی ساری موجودات کے مالک ہونے کی حقیقت کو آشکارا کیا ہے، اس طرح یہ ثابت ہوا کہ مال جس حالت میں بھی ہے اس کا حقیقی مالک اللہ ہے، انسان صرف مال کا امین ہے۔

مذکورہ بالا آیت قرآنیہ سے بھی یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ انسان کے پاس جو مال واملاک ہیں ان کا اصل مالک اللہ ہے، انسان محض اللہ کا نائب ہونے کے ناتے ان املاک میں تصرف کا مجاز ہے، لیکن اس کا تصرف اور رویہ مالک حقیقی کی ہدایات اور اوامر ونواہی کے تحت ہوگا، اللہ تعالی نے اپنی گوناگوں عنایات کی بدولت افراد کو مال سے نوازا، گویا ایک امانت سونپی اور اس میں تصرف کا اختیار دیا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ انسان کے مال پر مالکانہ حقوق مطلق نہیں بلکہ محدود اور مقید ہیں، جو اس کو اللہ کے دیئے ہوئے مال کے امین ہونے کا شرف بخشتے ہیں، اللہ کا نائب اور اس کے دیئے ہوئے مال کے امین ہونے کی حیثیت سے انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ مالک حقیقی کے احکامات بجالائے، مالکانہ تصرف کے باب میں خود کو آزاد سمجھنا اور ہدایات خداوندی سے اجتناب وانحراف کرنا صریح گمراہی ہے۔

ڈاکٹر فہیم اختر ندوی لکھتے ہیں:

''جہاں تک مال سے وابستہ دنیا اور آخرت کے مصالح کا تعلق ہے، تو دنیا میں اس کے مصالح اظہر من الشمس ہیں، ہر انسان مال کے فوائد اور اس کی خوبیوں سے آگاہ ہے، اس کے بیان کی ضرورت نہیں، البتہ مال سے وابستہ اخروی مصالح تین قسم کے ہیں:

اول یہ کہ انسان مال کو اپنی ذات پر خرچ کرے، مقصد یا تو عبادت ہو یا عبادت میں مدد حاصل کرنا ہو، جیسے حج اور جہاد وغیرہ جن میں مال خرچ کرنا ہوتا ہے، یا جیسے اپنے کھانے پینے، لباس اور رہائش وغیرہ پر خرچ تا کہ وہ اللہ کی عبادت دلجمعی اور یکسوئی سے کر سکے اور اس کے لئے طاقت حاصل کر سکے۔

دوم یہ کہ انسان مال کو لوگوں پر خرچ کرے، مثلاً غریبوں پر صدقہ وخیرات کرے، یا

لوگوں کی مہمان نوازی اور ہدایا میں خرچ کرے یا اپنی ذات سے مصیبت دور کرنے کے لئے اسے خرچ کرے، مثلاً اپنی عزت بچانے کے لئے۔

سوم یہ کہ رفاہ عام کے کاموں مثلاً پلوں اور اسپتالوں یا مساجد کی تعمیر وغیرہ پر خرچ کرے۔

یہ تینوں قسم کے خرچ مال کے اخروی مصالح ہیں، ان میں خرچ کر کے انسان آخرت میں اپنے لئے اجر وثواب کا ذخیرہ کرلیتا ہے۔ اول وہ بتاتا ہے کہ مال دراصل اللہ کا ہے، وہی کائنات کی تمام چیزوں کا مالک ہے، قرآن کا بیان ہے :"**له ما فی السموات وما فی الأرض وما بینهما وما تحت الثری**" (سورہ طہ:٦)۔ دوم وہ بتاتا ہے کہ اللہ نے یہ مال اور کائنات کی تمام چیزیں انسان کے فائدے کے لئے مسخر کررکھی ہیں، یہ بندوں پر اللہ کا احسان ہے۔"**ألم تر أن الله سخر لکم ما فی السموات وما فی الأرض جمیعاً**"(سورہ جاثیہ:١٣)۔ سوم وہ بتاتا ہے کہ مال کا مالک تو اللہ ہے، لیکن اس نے انسان کو اس مال کے اندر اپنا نائب بنایا ہے۔"**هو الذی جعلکم خلائف فی الأرض فمن کفر فعلیه کفره ولا یزید الکافرین کفرهم عند ربهم إلا مقتا**"(سورہ فاطر:٣٩)۔

چہارم وہ واضح کرتا ہے کہ مال کی وجہ سے کسی انسان کو دوسرے انسان پر فضیلت نہیں ملتی ہے، فضیلت کا معیار تو صرف خداترسی اور تقوی ہے۔"**إن أکرمکم عند الله أتقاکم**" (سورۃ الحجرات:١٣)۔

اسی طرح اسلام یہ تصور دلاتا ہے کہ مال مقصود نہیں بلکہ وسیلہ ہے، لہذا اس کے ذریعہ دنیا اور آخرت کے مصالح پورے کئے جائیں، خود مال کو مقصود نہ بنایا جائے (ماہنامہ ترجمان دارالعلوم دیوبند، ملکیت کا اسلامی تصور)۔

یہی وجہ ہے کہ معاشی ضروریات کا تحفظ بھی شریعت اسلامیہ کے بنیادی مقاصد میں سے اہم ترین مقصد ہے، امام عبدالقادر عودہ شہید رقم فرماتے ہیں:

"شریعت اسلامیہ کا مقصد اول لوگوں کی ضروریات کا تحفظ کرنا ہے، اور ضروریات زندگی وہ امور ہوتے ہیں جن پر انسانی زندگی کا دارومدار ہو اور جن کے بغیر صحیح معنوں میں زندگی

استوار نہ ہو سکے، بلکہ بدنظمی، انتشار اور فساد پھیل جائے، ضروریات زندگی میں پانچ امور شامل ہیں: مذہب، نفس، عقل، نسل اور مال، شریعت اسلامیہ نے ان میں سے ہر ایک ضرورت کو بروئے کار لانے، اس کو پروان چڑھانے اور اس کے تحفظ کے بارے میں احکام جاری کئے ہیں، اور ان امور سے متعلق احکام کو لازمی قرار دیا ہے (عودہ عبدالقادر: اسلام کا فوجداری قانون: مترجم: ساجدالرحمن ۱/ ۳۸۲)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے بنیادی ضروریات زندگی سے متعلق جن پانچ قسم کے انسانی حقوق کا تحفظ یقینی بنایا ہے، ان میں مال کا تحفظ شامل ہے، ہر فرد کی انفرادی ملکیت کے تحفظ کو یقینی بنانا اسلام کا خاصہ ہے، اسی لئے کسی فرد کے مال پر دست درازی کرنے والوں کے لئے اسلام نے سرقہ وحرابہ کی حدود مقرر کی ہیں تا کہ ہر فرد کا مال سلب ونہب سے محفوظ رہ سکے۔

مولانا محمد حنیف ندوی رقم طراز ہیں:

''نجی ملکیت کا مسئلہ فی نفسہ برائی نہیں ہے، بلکہ اس کی تہہ میں جو فلسفہ کارفرما ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص جن چیزوں کا جائز طور سے وارث ہے اور مال ودولت کی جس مقدار کو اس نے اپنی محنت وکاوش سے یا کاروباری مہارت سے جمع کیا ہے اس کا تحفظ کیا جائے، کوئی شخص زور، دھاندلی اور مکاری سے ان حقوق میں دخل اندازی نہ کر سکے۔ نجی ملکیت کے معانی دراصل تحفظ حقوق کے ہیں، یعنی ہر شخص اس اطمینان سے بہرہ مند ہو کہ معاشرے میں اس نے اپنی فکری وعملی صلاحیتوں کے بل بوتے پر جو کچھ حاصل کیا ہے وہ اس کا اپنا ہے، غیروں کو اس میں سلب ونہب کا حق نہیں (محمد حنیف ندوی: اساسیات اسلام/ ۲۴۷)۔

معلوم ہوا کہ شریعت اسلامیہ نے معاش کے باب میں انفرادی ملکیت کا تصور دیا ہے اور اس کے تحفظ کا احساس یقینی بنایا ہے کہ جو کچھ بھی اس کے پاس ہے وہ ذاتی حیثیت میں بہرحال اس کا مالک ہے اور کسی دوسرے کو بلا اجازت وبلا رضا اس میں تصرف کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے، اس کا باعث یہ ہے کہ ایک فرد کا مال کہنے کو ایک فرد کی ملکیت ہوتا ہے،

مگر اس کے اثرات پورے معاشرے پر پڑتے ہیں، چنانچہ ایک فرد کے مال کا تحفظ گویا تمام معاشرہ کے تحفظ کو یقینی بنانا ہے اور پورا معاشرہ اس کے فوائد سے بہرہ مند ہوتا ہے اور ایک فرد کا عدم تحفظ سے دوچار ہونا پورے معاشرے کو معاشی اور معاشرتی عدم تحفظ کا شکار کر دیتا ہے، جس کے مضر نتائج مجموعی طور پر پورے معاشرے کو بھگتنا پڑتے ہیں، معاشرہ کے افراد کے قبضہ میں مال محض ان کی انفرادی قوت کا ہی باعث نہیں ہوتا بلکہ پورے معاشرے کے لئے باعث قوت واستحکام ہوا کرتا ہے، اس لئے ضروری ہے کہ اسے صحیح طور پر محفوظ رکھا جائے، صاحبان مال اپنے مالوں سے منفعت حاصل کرنا چاہتے ہوں تو ان کے طریقہ کار کی محافظت بھی ضروری ہے تا کہ مفاسد عامہ سے محفوظ رہ سکے اور ایسا نہ ہو کہ لوگ اپنے مال کو باطل طریقہ سے کھا جائیں۔ شریعت نے اس نظام کے سلسلہ میں احکام صادر فرمائے ہیں اور احکام کی خلاف ورزی پر سزا تجویز کی ہے (تنزیل الرحمن: جرم وسزا کا اسلامی فلسفہ/ ۶۴)۔

مال کے تعلق سے شیخ محمد ابن طاہر نے بڑی تفصیل سے لکھا ہے، جس کا خلاصہ جمال الدین عطیہ نے اپنی کتاب ''اسلامی شریعت کا عمومی نظریہ'' میں کیا ہے، لکھتے ہیں:

اموال کے بارے میں شریعت کے جو احکام ہیں، ان کا مقصد پانچ چیزوں میں دائر ہے:

۱۔ اموال کا گردش کرنا: شریعت یہ چاہتی ہے کہ مال جائز طریقے پر جتنے زیادہ سے زیادہ افراد کے ہاتھ میں گردش کر سکتا ہو، گردش کرے، اسی مقصد کو بروئے کار لانے کے لئے معاملاتی عقود مشروع کئے گئے ہیں، ان میں بعض ایسے عقود بھی ہیں جن میں کسی درجہ میں غرر بھی پایا جاتا ہے، شریعت اس بات کی ہمت افزائی کرتی ہے، اسی طرح شریعت کسی معاوضہ کے بدلہ میں سکوں کے استعمال کی بھی ہمت افزائی کرتی ہے اور مختلف طریقوں سے معاملات کو آسان بناتی ہے، مثلاً مبیع کی آئندہ کسی خاص وقت میں حوالگی کی شرط کے ساتھ بیع کرنا، جیسا کہ بیع سلم میں ہوتا ہے، مبیع کے سامنے موجود نہ ہونے کے باوجود محض اس کے اوصاف بیان کرنے کی اباحت اور تجارت میں تحریر نہ لکھنے کی گنجائش دینا اور اس طرح دوسرے احکام جو شریعت نے معاملات کو آسان بنانے کے لئے نافذ کئے ہیں۔

۲۔ مالیاتی احکام سے اسلامی شریعت کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ مالوں کو ضرر اور خصومات سے حتی الامکان دور کیا جائے، اسی لئے شریعت نے دین کے جملہ معاملات میں گواہ بنانے اور رہن (گروی) کے معاملے میں تحریری طور پر معاہدہ کی تعلیم دی۔

۳۔ تیسرا مقصد مالوں کی حفاظت ہے، اسی لئے شریعت نے بازاروں کے نظام اور ذخیرہ اندوزی کے بارے میں کئی احکام دیئے ہیں، زکوۃ اور مال غنیمت کے مصارف کی تعیین کی ہے، اوقاف عامہ کا نظام مرتب کیا ہے اور دارالحرب میں تجارت کے احکام کی تعلیم دی ہے۔

۴۔ چوتھا مقصد اموال کی پائیداری ہے، شریعت مال والوں کے لئے مال کی ملکیت اس طرح ثابت کرتی ہے جس میں کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا اور نہ کسی نزاع کی گنجائش رہتی ہے، شریعت مالک کو اپنے مال پر پورا اختیار دیتی ہے، اسے مال میں تصرف کی پوری آزادی عطا کرتی ہے اور اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ مالک کی رضامندی کے بغیر مال اس سے نہیں چھینا جائے گا۔

۵۔ مالیاتی احکام سے شریعت کا پانچواں مقصد اموال کے بارے میں عدل کا قیام ہے تاکہ مالوں کا حصول جائز طریقہ سے ہو، ظالمانہ انداز میں نہ ہو اور عمومی مصالح کی حفاظت کے ساتھ مال کا حصول کیا جائے، دوسروں کو ضرر نہ پہنچایا جائے۔

جو معاملات اعمال بدنیہ کے بارے میں طے کئے جاتے ہیں (مثلاً اجارہ، مساقات، مفارسہ، مضاربت وغیرہ) ان میں شریعت کے آٹھ مقاصد ہیں:

۱۔ اعمال بدنیہ کے بارے میں منعقد ہونے والے معاملات کی کثرت۔

۲۔ متعارف غرر پائے جانے کے باوجود ان معاملات کی اجازت دینا۔

۳۔ ان معاملات میں ایسی شرطوں سے بچنا جو عامل کے لئے انتہائی دشوار ہوں۔

۴۔ محض ایجاب وقبول سے ان معاملات کے انعقاد کو لازم نہ ماننا، بلکہ اس وقت تک اختیار باقی رکھنا جب تک عامل کام شروع نہ کردے۔

۵۔ عمال کو بطور انعام زیادہ نفع دینے کی اجازت دینا۔

۶۔عامل کے عمل کا معاوضہ جلد از جلد دلوانا۔

۷۔عامل کے لئے عمل مکمل کرنے کے وسائل مہیا کرانا، اس طور سے کہ عامل کے ذمہ وسائل کے بغیر عمل کا اتمام لازم نہ کیا جائے۔

۸۔ہر ایسی شرط یا عقد سے دور رہنا جو عامل کو غلام بنا لینے کے مشابہ ہو۔

تبرعات یعنی صدقہ، ہبہ، عاریت کے احکام سے شریعت کے مقاصد چار ہیں:

۱۔تبرعات کی کثرت کرنا؛ کیونکہ اس میں عمومی مصالح بھی ہیں، اور خاص افراد کے مصالح بھی۔

۲۔یہ تبرعات خوش دلی سے ہونے چاہئے، پس وپیش اور دباؤ سے نہیں۔

۳۔تبرع کرنے والوں کی خواہش کے مطابق ان کے انعقاد کے وسائل میں توسع کرنا۔

۴۔تبرع کو دوسروں کے مال کے ضائع کرنے کا ذریعہ نہ بنانا۔ مثلاً وارث یا قرض خواہ کے حق کو ضائع نہ کرنا (اسلامی شریعت کا عمومی نظریہ/ ۱۲۸۔۱۳۰)۔

ملکیت کا اسلامی تصور:

ملکیت کا اصل حق اللہ تعالی کا ہے، بندہ خلیفہ کی حیثیت سے اس کا مالک ہے، یعنی جو کچھ انسان کی ملک میں ہے، وہ اللہ کی دی ہوئی ہے، اللہ تعالی فرماتے ہیں:

۱۔"**له ما في السموات وما في الأرض وما بينهما وما تحت الثرى**" (طٰہٰ:۶)۔

(اسی کی ملکیت ہیں جو چیزیں آسمانوں اور جو چیزیں زمین میں ہیں، اور جو چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں اور جو چیزیں تحت الثری میں ہیں)۔

۲۔"**وتبارک الذی له ملک السموات والأرض وما بینهما**" (الزخرف:۸۵)۔

(اور وہ ذات بڑی عالیشان ہے جس کے لئے زمین اور آسمان کی اور جو مخلوق اس کے درمیان ہے اس کی سلطنت ثابت ہے)۔

۳۔"**وللہ ملک السموات والأرض**" (الجاثیہ:۲۷) (اور اللہ ہی کی سلطنت ہے

آسمانوں اور زمین میں)۔

قرآن مجید میں ان آیات کے علاوہ اور بھی بہت ساری آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام اشیاء پر ملکیت کا اصل حق اللہ تعالی کے لئے ثابت ہے، البتہ ایسی آیات بھی ہیں جن میں مال کی نسبت انسان کی طرف کی گئی ہے، ان میں سے چند آیتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ "**وإن تبتم فلكم رؤوس أموالكم لا تظلمون و لا تظلمون**" (البقرہ:۲۷۹)۔

(اور اگر تم توبہ کرلوگے تو تم کو تمہارے اصل اموال مل جائیں گے، نہ تم کسی پر ظلم کروگے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا)۔

۲۔ "**خذ من أموالهم صدقة تطهّرهم و تزكّيهم بها**" (التوبہ: ۱۰۳) (آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لے لیجئے جس کے ذریعہ آپ ان کو (گناہ کے آثار سے) پاک صاف کردیں گے)۔

۳۔ "**و في أموالهم حق للسائل و المحروم**" (الذاریات: ۱۹) (اور ان کے مال میں سوالی اور غیر سوالی کا حق تھا)۔

مذکورہ بالا آیات سے واضح ہوتا ہے کہ مال میں انسان کی حیثیت صرف ایک خلیفہ کی ہے، یعنی انسان کو منفعت اور تصرف کا حق حاصل ہے، جس طرح اللہ تعالی ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

۴۔ "**و أنفقوا مما جعلكم مستخلفين فيه**" (الحدید: ۷)۔

(اور جس مال میں تم کو اس (اللہ تعالی) نے قائم مقام بنایا ہے، اس میں سے اس کی راہ میں خرچ کرو)۔

خلیفہ اور نائب کی حیثیت سے مال میں ملکیت انسان کو اگرچہ حاصل ہے لیکن یہ ملکیت بھی دو طرح کی ہے: (۱) ملکیت خاص، (۲) ملکیت عام۔

ملکیتِ خاص کا تعلق معاشرہ کے مخصوص افراد کے ساتھ ہے، اسلام مخصوص افراد کی ملکیت کا حامی اور ان کے حقوق کی حفاظت و رعایت کا علمبردار ہے، چنانچہ کسی آدمی کا مال ناجائز

طریقے سے لینا ممنوع ہے۔

نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: ''**فإن دماءكم وأموالكم وأعراضكم عليكم حرام كحرمة يومكم هذا في شهركم هذا في بلدكم هذا**'' (مسلم، رقم الحدیث: ۶۷۹) (بے شک تمہارا خون، تمہارے اموال اور تمہاری عزتیں تم پر حرام کی گئی ہیں اس (مبارک) دن اس (مبارک) مہینے اور اس (مبارک) شہر کی حرمت کی طرح)۔

اس آیت میں ایک دوسرے کے اموال کو ناجائز طریقے سے استعمال کرنے کی ممانعت کے بیان سے یہ امر بھی بخوبی واضح ہوجاتا ہے کہ مال میں ملکیت کا حق ایک فرد کو حاصل ہوتا ہے، اور وہ حق ملکیت محترم بھی ہے، یعنی کسی غیر کو ناحق طریقے سے ملک غیر میں دراندازی کا کوئی حق نہیں، مالک کو اپنے مال سے پورا پورا فائدہ اٹھانا اور اس کو اپنی ضروریات میں خرچ کرنے کی اجازت اگرچہ ہے، لیکن اگر کہیں مالک کا تصرف معاشرے کے اجتماعی ضرر کا سبب بن رہا ہو تو مالک کو اس طرح کے تصرف کا حق نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر فاروق (م ۲۴ھ) نے حضرت بلال بن الحارث (م ۶۰ھ) سے وہ زمین واپس لی تھی جو حضور نے ان کو عطا کی تھی، کیونکہ انہوں نے اس زمین کو بیکار چھوڑا تھا، حضرت عمر نے فرمایا: ''**ليس لمحتجر بعد ثلاث سنين حق**'' (نصب الرایہ ۴/۲۰۹) (پتھر نصب کرنے والے کو تین سال کے بعد کوئی حق نہیں)۔ اسی طرح معاشرے کی اجتماعی ضرورت وحاجت کے پیش نظر (احتکار) ذخیرہ اندوزی کی ممانعت کی گئی ہے، جیسے کہ عبداللہ بن عمرؓ (م ۷۳ھ) نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں: ''**من احتكر طعاماً أربعين يوماً فقد برئ من الله تبارك وتعالى وبرئ الله تبارك وتعالى منه**'' (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد ۴/۱۰۰)۔

(جو آدمی چالیس روز تک خوراک کو ذخیرہ کرے تو وہ اللہ تعالی سے بری ہے اور اللہ تعالی اس سے بری ہے)۔

حاصل یہ کہ اسلام نے جس طرح ایک فرد کی ملکیت کو تسلیم کر کے اس کے مال کو ناجائز طریقے سے غصب کرنے کی ممانعت کی ہے، اسی طرح معاشرے اور سوسائٹی کی اجتماعی

ضرر کے سد باب کی خاطر کسی آدمی کو اپنے مال میں ایسے تصرف کی قطعاً گنجائش نہیں چھوڑی، جس سے عام لوگ ضرر اور تکلیف میں مبتلا ہوں، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ثابت ہوا کہ اسلامی نظام اقتصاد میں ایسا توازن پایا جاتا ہے جو دوسرے نظاموں میں نظر نہیں آتا۔

"ولا یوجد هذا التوازن فی أی مذهب آخر فالرأسمالیة اتجهت نحو الفرد وأشباع رغباته دون حدود وقیود والمارکسیة ألغت مصلحة الفرد إلغاء تاماً"

(الاقتصاد الاسلامی والقضایا الفقهیہ المعاصرہ/۳۶)۔

اس توازن کو ہم دوسرے نظاموں میں نہیں دیکھتے، سرمایہ دارانہ نظام کی پوری توجہ بغیر کسی پابندی کے افراد اور ان کے مرغوبات (خواہشات) کی تکمیل کی طرف ہے اور مارکسزم (اشتراکی نظام) نے تو (سرے سے) فرد کی مصلحت ہی ختم کر دی ہے۔

ملکیتِ عام کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کے ساتھ تمام افراد کی ملکیت متعلق ہو، اس بارے میں بھی اسلامی تعلیمات میں اشارہ ملتا ہے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے: **"المسلمون شرکاء فی ثلاث: فی الکلأ والماء والنار"** (سنن ابی داؤد ۳/۲۷۸) (مسلمان تین چیزوں میں آپس میں شریک ہیں: خودرو گھاس، پانی اور آگ)۔ ایک دوسری روایت میں ہے: **"لا تمنعوا فضل الماء لتمنعوا به فضل الکلأ"** (صحیح بخاری، جلد ۳، حدیث نمبر: ۲۳۵۴) (زائد پانی کو مت روکو، کیونکہ اس کے ساتھ تم (خودرو) گھاس روکتے ہو)۔

ان تین چیزوں میں شرکت عام اس وجہ سے ہے کہ ان کی ضرورت بہت زیادہ پیش آتی ہے، البتہ اگر ان تین چیزوں کو کوئی مخصوص طریقے سے محفوظ اور محصور کر لے تو پھر ان میں بھی ملکیت خاص ہو جاتی ہے، روایات میں اگرچہ تین چیزیں وارد ہوئی ہیں، لیکن لوگوں کی ضروریات زمانے اور ماحول کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں، لہذا ان پر دوسری چیزوں کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ ان میں بھی ان ہی تین چیزوں کی طرح صفات پائی جائیں اور اسلام کے اصول وقواعد کے موافق ہوں، مثلاً ملکیت عام کی ایک قسم وہ چیزیں ہیں، جو ریاست کی ملکیت میں ہوں، جیسے بیت المال کی اراضی، زکوۃ کے اونٹ یا وہ اراضی شامل ہیں، جن میں عام لوگوں

کے جانور چرتے ہیں۔

نیز اسلامی نظام اقتصاد میں مال میں استحقاق صرف محنت یا خرچ کا ذریعہ نہیں بلکہ معاشرے میں بعض افراد کے لئے محنت اور خرچ کے بغیر بھی مال میں استحقاق اور حصہ داری تسلیم کی گئی ہے، ایسے مستحقین کے لئے استحقاق کی دو بنیادیں ہیں: (۱) حاجت مندی، (۲) قرابت داری۔

اسلام کے معاشی مقاصد:

یہ بات بالکل واضح ہے کہ معیشت کسی بھی ملک وقوم کی ترقی وخوشحالی میں ریڑھ کی حیثیت رکھتی ہے، معیشت کا استحکام قوم وملک کے استحکام کا ثبوت ہے جب کہ معاشی زوال قوم کے زوال کی دلیل ہے۔

دین اسلام جیسا عالمگیر مذہب معیشت کی اہمیت سے کبھی غافل نہیں ہوسکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اسلام نے معیشت کو غیر معمولی اہمیت دی ہے، اسلام نے معیشت کی ہموار رفتار کے لئے ایسے اصول وقواعد کا درس دیا ہے، جس سے معیشت کا پہیا چلتا بھی رہے اور معاشی وسائل بھی چند افراد کے ہاتھوں میں سمٹا نہ رہے، جس کی وجہ سے اسلامی نظام معیشت ۱۴۰۰ رسال گزرنے کے باوجود ہر دور کی ضروریات کے لئے وسائل فراہم کررہا ہے، اور ترقی کے زینے طے کررہا ہے۔

اس کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکیت اپنے تمام تر بلند دعوؤں کے باوجود رو بہ زوال ہے، تمام دنیا غربت، افلاس اور فقر کے لپیٹ میں جلتی جارہی ہے اور لوگ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف مظاہروں پر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ سرمایہ کار اور صنعت کار اسلامی بینکاری کی طرف راغب ہورہے ہیں۔ اسلام کے معاشی مقاصد کے تعلق سے حضرت مولانا شمس الحق افغانی نے اپنے مقالے میں بڑی اچھی بات لکھی ہے، لکھتے ہیں:

''اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لئے اسلام نے اپنے معاشی نظام میں بھی فطرت

انسانیہ کا لحاظ رکھا ہے، اور تمام فطری امور کو اپنی حالت پر رہنے دیا، البتہ جہاں کہیں ان میں کجی، زیغ اور بے اعتدالی واقع ہوئی تھی اس کا ازالہ کر کے اس کو اعتدال پر لایا گیا، اسلام کے معاشی نظریے کے خلاف اکتنازیت اور اشتراکیت کے معاشی نظریات میں چونکہ بے اعتدالیت اور فطرت انسانی کے حدود سے انحراف موجود تھا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں نظریات جذباتی تھے اور جذباتی نظریات کے لئے فطرت کی حدود شکنی لازم ہے، اس لئے اسلام نے اپنا معاشی نظام ایسا معتدل اور موافق فطرت رکھا کہ اس میں انسان کے تمام طبقات کا معاشی تحفظ اور حقوق کی رعایت بھی موجود رہی اور سرمایہ دارانہ نظام کی تمام خامیاں بھی اس میں دور کی گئی ہیں۔ اسلام نے اپنے معاشی نظام میں ان تمام دروازوں کو بند کیا گیا جن سے عوام کی معاشی حالت متاثر ہوتی تھی جن سے سرمایہ دار غریب طبقے کا خون چوستے تھے اور ان تمام امور کی بھی مخالفت کی گئی جن سے انسانی حریت اور شرافت اور خودمختارانہ جوش عمل پر برا اثر پڑتا تھا، غرباء میں امراء کے خلاف جذبۂ عداوت کو تیز کرنے کے بجائے جذبۂ ایمانی اور اخلاقی کے ذریعہ دونوں میں محبت کا ربط قائم کر کے فقراء کے حقوق کو محفوظ کیا گیا، بجائے غیر فطری مالی مساوات کے امراء اور غرباء میں اکتساب رزق میں قانونی مساوات قائم کیا، قوانین عدلیہ میں امیر وغریب اور شاہ وگدا کو برابر رکھا، اور ایسے امور میں جو انسانی جدوجہد کی پیداوار نہیں اور جن پر انسانی سعی وعمل اور محنت کے ذریعہ جائز طریقے سے بالذات یا بالواسطہ کسی انسان کا قبضہ نہ ہوا ہو ان کو سب انسانوں کی مشترکہ ملکیت قرار دیا (مقالہ: اسلام کا معاشی نظام: مولانا شمس الحق افغانی ر ۵۹۰)۔

مولانا محمد طاسین صاحب اسلام کے معاشی مقاصد کے تعلق سے لکھتے ہیں: ''قرآن وحدیث کے مطالعہ اور غور وفکر سے جس نتیجہ پر پہنچا ہوں، وہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر اسلام کے معاشی مقاصد دو ہیں جن کو وہ اپنے معاشی تعلیمات کے ذریعہ بروئے کار لانا چاہتا ہے:

ایک یہ کہ بلا کسی تخصیص وامتیاز کے معاشرے کے ہر فرد کو وہ بچہ ہو یا بوڑھا، عورت ہو یا مرد، مریض ہو یا تندرست، نیک ہو یا بدکار، مسلم ہو یا غیر مسلم، کم از کم اتنا سامانِ معاش ضرور میسر ہو، جس کے بغیر عام طور پر ایک انسان اطمینان کے ساتھ نہ زندہ رہ سکتا ہے، اور نہ اپنے

فرائض وواجبات کوٹھیک طریقہ سے ادا کرسکتا ہے، جومختلف حیثیات سے اس پر عائد ہوتے ہیں اور جن کا ادا کرنا اسلام کی رو سے نہایت ضروری ہے۔ بالفاظ دیگر گو سادہ سے سادہ شکل میں اور معمولی سے معمولی معیار پر سہی، لیکن معاشرے کے ہر فرد کو اتنا سامان ضرور میسر ہو جن کے بغیر زندگی کی بنیادی احتیاجات پوری نہیں ہوسکتیں، اور انسان اطمینان کے ساتھ زندہ رہ کر اپنی مذہبی معاشرتی اور سماجی ذمہ داریوں کو ٹھیک طرح سے ادا نہیں کرسکتا جن کا ادا کرنا معاشرے کے اعتدال وتوازن کے لئے ضروری ہوتا ہے، زیادہ واضح الفاظ میں مطلب یہ ہے کہ معاشرے کے ہر فرد کے لئے کسی نہ کسی درجہ میں خوراک، لباس، مکان، علاج اور تعلیم وغیرہ کا ضرور انتظام ہو اور کوئی فرد ان بنیادی ضروریات سے بالکل محروم نہ رہے۔ یہ ایک معاشی مقصد ہے جس کو اسلام ضرور بالضرور حاصل کرنا چاہتا ہے، اور کسی صورت نظر انداز نہیں کرتا۔ دوسرے لفظوں میں مطلب یہ کہ اسلام کے نزدیک یہ صحیح نہیں کہ معاشرے کے بعض افراد کے پاس تو ضرورت سے کہیں زیادہ بلکہ درجہ آسائش سے بڑھ کر درجہ تعیش اور تنعم تک معاشی سروسامان ہو، اور دوسرے بعض کے پاس ضرورت کی حد تک بھی نہ ہو، اسی طرح اس کے نزدیک یہ بھی درست نہیں کہ معاشرے کے بعض افراد کے لئے معاشی ترقی کے راستے پوری طرح کھلے ہوں۔

وہ ضرورت سے زائد جتنا چاہیں معاشی سروسامان حاصل کرسکیں، لیکن دوسرے بعض وہ راستے بالکل بند نہ کرسکیں؛ کیونکہ ان دونوں صورتوں میں دیرسویر ایسے حالات کا پیدا ہونا لازمی اور قطعی ہوتا ہے جو پورے معاشرے کو بدامنی، بے چینی اور تباہی وبربادی میں مبتلا کرکے رکھ دیتے ہیں، اور یہ چیز اسلام کے منشا کے خلاف ہے؛ کیونکہ وہ یہ چاہتا ہے کہ معاشرے میں جو امن واطمینان پیدا ہو وہ دوام اور پائیداری کے ساتھ قائم رہے۔

آگے لکھتے ہیں: اسلام چونکہ یہ چاہتا ہے کہ افراد کو جو امن وچین اور مسرت واطمینان حاصل ہو، وہ پائیدار اور مسلسل ہو، عارضی اور وقتی نہ ہو، کیونکہ اسلام کے نزدیک فرد کی فوز وفلاح اور کامیابی وکامرانی کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو مسلسل ودائمی امن وچین اور غیر محدود ولازوال مسرت واطمینان کی زندگی نصیب ہو، یعنی وہ عارضی مسرت واطمینان اور محدود سکھ وچین کے

حاصل ہوجانے کو فرد کی فوز و کامیابی قرار نہیں دیتا؛ بلکہ اس مسرت واطمینان اور سکھ چین کے حاصل ہوجانے کو قرار دیتا ہے جس میں دوام اور خلود ہو، اور جس کا سلسلہ کہیں رکتا اور ٹوٹتا نہ ہو، اس لئے کہ درحقیقت یہی وہ فطری مطلوب بھی ہے جس کی طلب وخواہش ہر انسان کے اندر پیدائشی اور اضطراری طور پر پائی جاتی ہے، جس کی تلاش وجستجو میں ہر فرد بشر شعوری اور غیر شعوری طور پر ہمیشہ سرگرداں اور جس کو پانے کے لئے ہر انسان ہمہ وقت سرگرم عمل اور مصروف جدوجہد رہتا ہے، اسی بنا پر اسلام کی رو سے ایک صحیح مثالی معاشرہ اور ایک صالح نظام تمدن وہ ہے جس میں فرد کو وہ جملہ روحانی اور مادی سروسامان دوام اور ہمیشگی کے ساتھ میسر ہو جس سے انسان کے روحانی اور جسمانی تقاضوں کو تسکین ملتی ہے، اس کی زندگی میں خوشگوار اور پائیدار امن واطمینان پیدا ہوتا ہے، اور وہ اپنے ارتقائی مدارج عمدگی کے ساتھ پے در پے طے کرتا چلا جاتا ہے، اس کے مقابلہ میں جو معاشرہ اور نظام تمدن ایسا ہو کہ اس میں مثلاً فرد کے مادی تقاضوں کی تسکین کے لئے مادی سروسامان تو موجود ہو، لیکن اس کے روحانی تقاضوں کے لئے معنوی سروسامان موجود نہ ہو، یا اس کے برعکس روحانی سروسامان تو موجود ہو، لیکن مادی موجود نہ ہو، یا یہ کہ دونوں موجود ہوں، لیکن ناقص اور عارضی طور پر، ہر ایسے معاشرے اور تمدن میں چونکہ فرد کو اس کا فطری مطلوب یعنی پائیدار ومسلسل مسرت واطمینان اور دائمی وغیر محدود سکھ کی زندگی نصیب نہیں ہوسکتی، لہذا اسلام کے نزدیک ایسا معاشرہ، اور جس نظام فکر وعمل اور ضابطہ، قانون واخلاق کے تحت وہ معاشرہ تشکیل پایا ہو، وہ غلط اور باطل ہے (اسلام کے معاشی مقاصد: مولانا محمد طاسین/ ۶۷۲۔ ۶۷۵)۔

باب سوم:

مال — مقاصد شریعت کی روشنی میں

مال وملکیت کے تعلق سے (جیسا کہ تفصیل سے پیچھے ذکر کیا جاچکا ہے حفاظت مال کو تمام فقہاء اسلام نے بالاتفاق شریعت کے پانچ بنیادی مقاصد میں سے ایک قرار دیا ہے)، اپنے زیر انتظام اور زیر تصرف مال کی حفاظت کریں، کیوں کہ ہم اور آپ اس مال کے امین ہیں، ہمیں اس مال کا جانشیں بنایا گیا ہے، ویسے تو اس مال کا اصل مالک اللہ تعالی کی ذات ہے، ہم صرف اس کے نائب ہیں، لیکن جس طرح اگر کوئی شخص کسی کو اپنی جائیداد کا متولی مقرر کرے اور وہ اس کی حفاظت نہ کرے تو اس کو ایک نالائق متولی اور ایک نااہل متقوم قرار دیا جائے گا اور اس کو جائیداد کی تولیت کے منصب سے ہٹا دیا جائے گا، ٹھیک اسی طرح جو بندہ رب کی اس امانت کو غلط طریقوں، اسراف اور بے جا امور میں لٹا دے تو اللہ کے یہاں اس کی بھی گرفت ہوگی، اس لئے مال کی حفاظت بھی ضروری ہے اور مال کو ضائع ہونے سے بچانا بھی ضروری ہے۔ عموماً لوگ اپنے مال کو بچاتے بھی ہیں، کسی نہ کسی سطح پر ہر کوئی اس کی کوشش کرتا ہے، لیکن دوسرے کے مال کی حفاظت کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھے، اس پر بھی شریعت نے بہت زور دیا ہے، جس طرح ہر انسان کی عزت محترم ہے، اسی طرح اس کا مال بھی محترم ہے، جس طرح ہر انسان کی عزت مقدس ہے، اس کی جائز ملکیت بھی مقدس ہے اور ان سب کا احترام ہر عاقل، بالغ انسان کی ذمہ داری ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے جان دے بیٹھے تو اس کو شہید کا درجہ دیا جائے گا۔ **"من قتل دون ماله فهو شهيد"** (بخاری: کتاب المظالم/ ۲۴۸۰) (جو شخص اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے اس کا درجہ شہید کا ہوگا)، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت نے مال کو کتنی اہمیت دی ہے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب مرحوم مال کے تعلق سے رقمطراز ہیں:

''اسلامی مالیات کے مقاصد شریعت پر مبنی ماڈل میں مال کو وہ مقام ملے گا جو اسلامی تصور حیات میں اسے دیا گیا ہے، یعنی مال اچھی زندگی گزارنے کے ذریعہ/وسیلہ کے طور بھی چاہئے، کیوں کہ مال بذات خود مقصود حیات نہیں، سرمایہ دارانہ نظام میں مال کو مزید کمانے کے ذریعہ کے طور پر جانا جاتا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام زر اور نظام مالیات، دونوں اس طرح منظم کئے جاتے ہیں کہ مالداروں کو اپنے مال کے ذریعہ مزید مال کمانے کے بیش از بیش مواقع حاصل ہوں'' (معاش، اسلام اور مسلمان/ ۱۱۰)۔

اب یہ کہ مال کیسے کمایا جائے؟ طریقے کیا ہوں گے؟ جائز و ناجائز حدود کیا ہوں گے؟ تو ہم دیکھتے ہیں کہ تجارت اور معیشت سے متعلق احادیث میں جو سب سے اہم اور بنیادی مضمون بیان ہوا ہے وہ خرید و فروخت، تجارت، اور لین دین کے قواعد ہیں، خرید و فروخت اور تجارت انسانی معاشرے میں شروع سے جاری رہی، انسان جب سے روئے زمین پر زندگی گزار رہا ہے اس وقت سے اس میں کسی نہ کسی قسم کا لین دین اور تجارت بھی جاری ہے خواہ وہ ابتدائی نوعیت کی تجارت ہو یا بہت ترقی یافتہ نوعیت کی تجارت ہو، انسانوں کا کوئی معاشرہ اس سے خالی نہ رہا ہے، بلکہ قرآن و حدیث کا مزاج یہ ہے کہ اگر کوئی مفید، مثبت اور جائز کام ہو رہا ہو تو اس کو باقی رکھا جائے بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی جائے، ہاں! اگر اس جائز کام میں کہیں کوئی ناجائز عنصر شامل ہو گیا ہے تو اس ناجائز عنصر کی نشاندہی کر کے اس کو ختم کر دیا جائے اور اگر کسی جائز کام کو مزید بہتر بنایا جا سکتا ہو، تو اس کو مزید بہتر بنانے کے لئے جہاں جہاں ضروری محسوس ہو ہدایات دی جائیں اور اگر کوئی چیز بالکل ناجائز اور حرام ہو تو پھر وضاحت سے اس کی حرمت کو بھی بیان کیا جائے، اس کے اسباب بھی بیان کئے جائیں، اس کی حکمت پر بھی روشنی ڈالی جائے، اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ حرام فعل کے ارتکاب کے جتنے ممکنہ راستے ہو سکتے ہیں ان سب کو بند کرنے کی ہدایت دی جائے، بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسانوں کو یہ

اندازہ نہیں ہوتا کہ فلاں کام جس کو وہ جائز سمجھ رہا ہے یا جس کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے تو بہت بے ضرر سا ناجائز کام کا راستہ ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں اس ناجائز کام کے راستے کھل جاتے ہیں، جس کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے، اس لئے احادیث میں کاروبار کے ایسے بہت سے طریقوں کی ممانعت کی گئی ہے جو عرب میں رائج تھے اور بظاہر ان میں کوئی بڑی قباحت نہیں معلوم ہوتی تھی، لیکن غور کر کے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کا روبار اگر جاری رہے لوگ اس میں مصروف ہو اور بڑی تعداد میں اس کو اختیار کرلیں تو اس سے کسی بڑی برائی کے راستہ کھلنے کا قوی امکان رہتا ہے، اس لئے اللہ کی شریعت نے ان راستوں کو بند کر دیا اور ایسے تمام کاروباری طور طریقے حرام قرار دے دیئے جن سے کسی بڑے حرام کا راستہ کھل سکتا ہے۔

تجارت اور مالیات اسلام کے نزدیک انسانی زندگی کے بہت سے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے کل نہیں ہے، انسانی زندگی کے اور بھی بہت سے پہلو اور شعبے ہیں، مثال کے طور پر تجارت و معیشت کے علاوہ بھی انسان کی بہت سی ذمہ داریاں ہیں، لیکن انسانوں کے بہت سے مشاغل اور بہت سی ذمہ داریوں میں سے ایک تجارت بھی ہے، معیشت بھی ہے اور مالیات بھی ہے۔ قرآن مجید نے ہر مال و جائداد اور ہر ملکیت کا حقیقی خالق اور مالک اللہ تعالی کو قرار دیا ہے، انسان اس کا امین ہے، مجازی طور پر صرف انسان اس کا مالک ہے، گویا جس چیز کو اللہ نے آپ کے انتظام اور امانت میں دیا ہے، جس پر تصرف کرنے میں آپ اللہ کے خلیفہ ہیں اس سے استفادہ کرنے کا اختیار صرف آپ کو ہے کسی اور کو نہیں ہے، اب اگر کوئی دو شخص اس بارے میں کوئی لین دین کرنا چاہیں تو اس کے لئے بنیادی ہدایات قرآن مجید اور ضروری اصول سنت نے بیان کر دیئے ہیں۔

دوسری طرف جہاں کسی معاملے کے ربا ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ ہے تو اس کا فیصلہ نصوص کی بنیاد پر کیا جائے گا، جس کے لئے قرآن و احادیث کے واضح احکام کو سامنے رکھا

جائے گا، وہیں دوسری طرف معاملات کے بارے میں عمومی قواعد کو بھی سامنے رکھنا پڑے گا، معاملات کے بارے میں شریعت کے عمومی قواعد میں کچھ تو وہ ہیں جن کا قرآن وحدیث میں صراحت کے ساتھ تذکرہ ہے اور کچھ وہ ہیں جن کا تذکرہ صراحت کے ساتھ تو نہیں ہے لیکن فقہاء اسلام نے قرآن مجید کی متعدد نصوص سے اور متعدد احادیث سے ان اصولوں کا استنباط کیا ہے، اس لئے ان کی حیثیت بھی منصوص اصولوں کی ہے، جیسے کہ فقہاء اسلام نے معاملات کے تعلق سے ایک اصول کا ذکر کیا طیب نفس یا رضا بالنفس اور تراضی کا لفظ قرآن کریم میں آیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر قسم کی تجارت اور ہر قسم کے لین دین میں فریقین کی مکمل رضامندی ضروری ہے، اس لئے معاملات میں جہاں نصوص کے پیش نظر معاملے کو جائز اور ناجائز قرار دیا جائے گا وہیں طیب نفس اور رضا کی عدم موجودگی بھی اس معاملہ کو ناجائز بنادے گا۔

اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ معاملات کے باب میں شریعت نے تھوڑی سی نرمی رکھی ہے یعنی شریعت نے معاملات کے بارے میں واضح طور پر ناجائز اور حرام چیزیں بتادی ہیں کہ فلاں فلاں چیزیں حرام ہیں مثلاً سود حرام ہے، غرر حرام ہے، قمار حرام ہے، تطفیف حرام ہے وغیرہ قرآن اور سنت سے محرمات کی فہرست بآسانی اخذ کی جاسکتی ہے، دوسری طرف جو چیزیں لازمی ہیں اور تعداد میں کم ہیں ان کی تفصیل دے دی ہے۔ ان محرمات سے بچتے ہوئے اور ان لازمی چیزوں کی پابندی کرتے ہوئے آپ معاملات میں جو کرنا چاہیں وہ کریں، جو طریقہ اختیار کرنا چاہیں وہ کریں، جس طرح کا معاملہ آپ کرنا چاہیں کریں آپ کے اختیار میں ہے، کوئی کاروباری یا تجارتی معاملہ ناجائز نہیں، اگر وہ شریعت کے محرمات سے بچ کر ہو اور جو چند عمومی واجبات اور فرائض ہیں ان کے مطابق ہو، گویا چند طے شدہ محرمات کے علاوہ سب جائز ہیں۔

اور اس سلسلہ میں شریعت کا اہم اصول ہے، ''الأصل فی الأشیاء الإباحة'' (اصل اشیاء میں مباح ہونا ہے)۔ تجارت کی جو ممکنہ صورتیں ہیں وہ جائز صورتیں ہیں، بشرطیکہ اس کے نتیجے میں کوئی اور خرابی پیدا نہ ہو، یا وہ صورتیں آگے چل کر برائی کا ذریعہ نہ بن سکیں جسے ہم ''سد ذریعہ'' کہتے ہیں۔

اگر ہم معاملات کی بات کریں، تو معاملات وکاروبار کی کچھ شکلیں تو وہ ہیں جن میں مال کے بدلے مال ہو، آپ نے پیسے دے کر کتاب لے لی، ایک طرف کتاب ہے اور دوسری طرف پیسے ہیں، یا اسی طرح ایک طرف بھی مال ہے دوسری طرف بھی مال ہے یا جیسے آپ نے کسی سے کوئی چیز خریدی، کوئی مکان خریدلیا، یہ بھی مال کے بدلے مال ہے، خرید وفروخت یا بارٹرسیل (اشیاء کا باہمی تبادلہ) کی جتنی بھی شکلیں یا قسمیں ہیں، جن میں مال کے بدلے مال ہے، یہ سب وہ معاملات ہیں جن کو شریعت کی اصطلاح میں بیع کہتے ہیں : **"أحل الله البيع وحرم الربوا"** (بقرہ:۲۷۵) اللہ نے بیع یعنی تجارت کو جائز اور ربوا کو حرام قرار دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے احادیث میں بقول "ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم": جن چھپن معاملات کی ممانعت فرمائی ہے، ان معاملات کو علماء اسلام نے تین قسموں میں تقسیم کیا ہے، ان معاملات کا بڑا حصہ تو وہ امور ہیں جو ربا کے راستے کو بند کر دینے کے لئے حرام قرار دیئے گئے ہیں کیوں کہ یا تو ان میں براہ راست ربا پایا جاتا تھا یا ان سے ربا کا دروازہ کھل سکتا تھا۔

کچھ معاملات وہ ہیں جو یا تو خود غرر تھے یا ان کے ذریعہ غرر کا راستہ کھل سکتا تھا اور غرر سے مراد یہی ہے کہ کسی ایسی چیز کی خرید وفروخت جو اس وقت موجود نہ ہو اور آئندہ طے شدہ شرائط کے مطابق اس کی فراہمی بیچنے والے کے بس میں نہ ہو یعنی اس چیز کے بارے میں بیچنے والے کو یقینی طور پر معلوم نہ ہو کہ وہ اس کو فراہم کرسکتا ہے یا نہیں کرسکتا، یہ چیزیں غرر میں داخل ہیں۔

تیسری چیز قمار یا میسر تھی جو جوا کی مختلف صورتوں کے نام ہیں، آج کل بہت سے معاملات جو بینکوں کے ذریعہ ہو رہے ہیں، یا کاروباری حلقے میں ہو رہے ہیں، ان میں قمار یا میسر پایا جاتا ہے، یہ طرح طرح کی لاٹریاں اور قرعہ اندازیاں ہیں، جن کا بڑا حصہ ان ناجائز معاملات پر مشتمل ہے جن کے ناجائز ہونے کی صراحت قرآن وحدیث میں واضح طور پر آئی ہے۔

"جہاں تک ربا کا تعلق ہے تو ابن قیم کے بقول ربا کی حرمت کو کسی متعین صورت یا

متعین الفاظ تک محدود کرنا درست نہیں ہے، بلکہ ربا کی حرمت کا تعلق اس حقیقت کی وجہ سے ہے جس سے وہ تجارت اور خرید وفروخت سے جدا ہوتا ہے، یہ حقیقت ربا جہاں بھی پائی جائے گی وہاں حرمت کا حکم بھی منطبق ہوگا، چاہے اس میں الفاظ کوئی بھی اختیار کئے جائیں، شریعت کے احکام کا دارومدار حقائق پر ہوتا ہے، الفاظ اور عنوانات پر نہیں ہوتا، لہذا کاروبار اور سرمایہ کاری کے تمام معاملات میں بنیادی سوال جو کرنے کا ہے وہ یہ ہے کہ کیا یہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے بیع اور تجارت میں داخل ہیں؟ اگر ہاں! تو پھر یہ جائز ہے، اور اگر یہ بیع وتجارت میں داخل نہیں ہے تو پھر یہ دیکھنا چاہئے کہ کیا یہ ناجائز معاملات کی فہرست میں تو شامل نہیں ہیں، اگر ان میں غرر، قمار، ربا یا اس طرح کی کوئی چیز پائی جاتی ہے تو پھر ان کو ناجائز قرار دینا ہوگا اور محض اس بنیاد پر ان میں سے کسی چیز کو جائز قرار دے دینا درست نہیں ہوگا کہ یہ رائج الوقت طریق کار کی حیثیت اختیار کر گیا ہے اور عامۃ الناس اس سے مانوس ہیں'' (محاضرات معیشت وتجارت ۳۵۶/)۔

سود کے نقصانات

اخلاقی نقصانات:

سود کے حرام ہونے کی جہاں بہت ساری حکمتیں ہوسکتی ہیں، وہیں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ وہ تمام اخلاقی قدروں کو پامال کر کے خودغرضی، بے رحمی، سنگ دلی، زر پرستی اور کنجوسی کی صفات پیدا کرتا ہے، اس کے برعکس اسلام ایک ایسے معاشرے کی تعمیر کرنا چاہتا ہے جو رحم وکرم، محبت ومودت، ایثار وتعاون اور بھائی چارہ کی بنیاد پر قائم ہو، تمام انسان مل جل کر زندگی گذاریں، ایک دوسرے کی مصیبت میں کام آئیں، ناداروں کی امداد کریں، دوسرے کے نفع کو اپنا نفع اور دوسرے کے نقصان کو اپنا نقصان سمجھیں، رحمدلی اور سخاوت کو اپنا شعار بنائیں اور اجتماعی مفاد کے آگے کسی بھی چیز کو کچھ نہ سمجھیں، انسانوں میں یہ تمام صفات پیدا کر کے اسلام انہیں انسانیت اور شرافت کے اس اوج کمال تک پہنچانا چاہتا ہے جہاں سے انہیں اشرف المخلوقات کا خطاب عطا ہوتا ہے، اس کے برخلاف سود، خواہ تجارتی ہو یا مہاجنی، وہ جس ذہنیت کو جنم دیتا ہے اس میں ان اخلاقی اوصاف کی کوئی جگہ نہیں، قرض دینے والے ساہوکار کو صرف اپنی پرواہ ہوتی ہے، آگے اسے کوئی سروکار نہیں کہ مقروض کو نفع ہو یا نقصان، نفع ہوا تو کتنا؟ کتنی مدت میں؟ اور کتنے پاپڑ بیلنے کے بعد؟ وہ مسلسل اپنے دیئے ہوئے مال پر منافع وصول کرتا رہتا ہے، اس کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ مقروض کو جتنا ہو سکے دیر میں نفع ہو، تاکہ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا سود بڑھتا اور چڑھتا رہے، اسے مدیون کے نقصان کا کوئی بھی غم نہیں ہوتا، کیونکہ نفع نقصان کی ہر شکل میں اس کا نفع کھڑا رہتا ہے، یہ چیز خودغرضی کو اس قدر بڑھا دیتی ہے کہ ایک سرمایہ دار کسی حاجت مندانہ قرضے میں بھی اپنی رقم کو بلا سود لگانے پر راضی نہیں ہوتا، وہ یہ سوچتا ہے کہ یہ فاضل رقم کسی تاجر کو کیوں نہ دے دوں تاکہ گھر بیٹھے ایک

معین نفع مجھے حاصل ہوتا رہے، اس خیال کے پیش نظر ایک شخص کے گھر میں اگر ایک بے گور وکفن لاش پڑی ہے یا اس کا کوئی عزیز دم توڑ رہا ہے، وہ بھی اس کے پاس آ کر اسے قرض مانگے تو وہ یا تو انکار کر دے گا یا تمام اخلاقی قدروں کو بالائے طاق رکھ کر اس سے بھی سود کا مطالبہ کرے گا، اس موقع پر بالعموم حرام کھاتے کھاتے قساوت قلبی کی یہ صفت اس درجہ رنگ جما لیتی ہے کہ اس وقت مدلل لیکچر اور پر اثر مواعظ کچھ کام نہیں آتے، سود خور دولت مند کو اپنی چاروں طرف پیسہ ہی ناچتا نظر آتا ہے، اس لئے اس وقت آپ کو یہ شکایت نہیں ہونی چاہئے کہ وہ ہماری بات کیوں نہیں سنتا، اس کے پاس بزبان حال یہ جواب ہے:

اندرون قعر دریا تختہ بندم کردہ ای
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش

پھر جب لوگ دیکھتے ہیں کہ فاضل سرمایہ اس قدر نفع بخش ہے کہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر بھی ایک یقینی نفع حاصل ہوسکتا ہے تو ان میں زر اندوزی کا جذبہ جنگل کی آگ کی طرح پھیلتا ہے اور وہ پیسہ بچانے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، بسا اوقات وہ اسی حرص کے نشے میں ناجائز ذرائع سے روپیہ کمانے کی کوشش کرتے ہیں، جس کی وجہ سے اور کچھ نہیں تو ان میں کنجوسی ضرور پیدا ہوجاتی ہے، پھر اس مرحلے پر زر اندوزی کے میدان میں وہ دوڑ شروع ہوتی ہے کہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں دوسرے سے زیادہ پیسے جمع کرلوں اور پھر یہ دوڑ حسد، بغض اور عداوت کو جنم دیتی ہے، بھائی بھائی کی لڑائی ہوتی ہے، دوست دوست سے جلنے لگتا ہے، باپ کو بیٹے اور بیٹے کو باپ کے نقصان کی کوئی پروا نہیں ہوتی، یہاں تک کہ نفسی نفسی کے اس محشر میں انسانیت سسک سسک کر دم توڑ دیتی ہے۔

ربا الفضل اور ربا النسیئہ کی حرمت کا سبب:

ربا الفضل اور ربا النسیئہ کی حرمت کے پیچھے کیا حکمت ومصلحت کارفرما ہے؟ آیا ان کے اندر کوئی علت پائی جاتی ہے؟ یا یہ ایک تعبدی معاملہ ہے؟ یہ سوالات فقہائے اسلام کے

درمیان کافی نزاع کا باعث رہا ہے، ظاہری مسلک کے لوگ تو اسے ایک تعبدی معاملہ قرار دیتے ہیں اور اس کی حرمت کو صرف ان چھ اشیاء تک محدود رکھتے ہیں جن کا حدیث میں ذکر آیا ہے، جبکہ دیگر مکاتب فقہ نے ان کی علت تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور جہاں بھی وہ علت پائی گئی اس حکم پر وہاں بھی منطبق کیا ہے، گو کہ اس علت کی تعیین میں ان کے یہاں بھی اختلاف ہے، امام غزالی کے نزدیک اس حرمت کی غرض وغایت یہ ہے کہ زر کے وظائف واعمال کا تحفظ ہو سکے، خود زر کا لین دین نہ ہونے لگے، چنانچہ فرماتے ہیں:

''جو شخص درہم ودینار پر سودی معاملہ کرتا ہے، وہ اللہ کی نعمت کا کفران کرتا ہے اور ایک بڑے ظلم کا ارتکاب کرتا ہے، کیوں کہ زر کو دوسرے مقاصد کی انجام دہی کے لئے پیدا کیا گیا ہے، نہ کہ وہ بذات خود مقصود ہیں، جو کوئی خود درہم ودینار کی تجارت کرنے لگے تو گویا اس نے ان کو مقصود بالذات قرار دے دیا ہے جبکہ ان کی تخلیق کا یہ مقصد نہیں ہے، زر کو اس لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے کہ خود اس سے زر کمایا جائے، یہ سخت ظلم ہے، زر کی یہ دو قسمیں تو صرف اس لئے ہیں کہ ان کے ذریعہ دوسری چیزیں حاصل کی جائیں، وہ بذات خود مطلوب نہیں ہیں، درہم ودینار کا تعلق دوسری اشیاء سے ویسا ہی ہے جیسے حروف (Letters) جملے میں ہوتے ہیں، جن کی تعریف ماہرین قواعد زبان نے یوں کی ہے کہ ''حرف وہ ہے جو جملہ میں کسی خاص معنی کو بیان کرنے کے لئے آئے (الگ سے اس کا مستقل کوئی معنی نہ ہو) یا زر کی مثال آئینہ کی سی ہے، جو رنگوں کو دکھاتا ہے لیکن اس کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہوتا، اگر کسی شخص کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ زر کو زر سے بیچے تو یہ معاملہ مقصود بالذات بن جائے گا، پھر زر کو بھی دیگر اشیاء کی طرح روک رکھنے اور ذخیرہ کرنے کا عمل شروع ہو جائے گا، جس طرح کسی حاکم یا قاصد کو قید کر دینا سخت قسم کا ظلم ہے کیوں کہ اس طرح وہ اپنے وظائف کو انجام نہیں دے پائیں گے، اسی طرح زر کا معاملہ بھی ہے اس کو قید کر کے رکھنا ظلم ہے''۔

مذکورہ بالا اقتباس میں امام غزالی نے ربا الفضل اور ربا النسیہ کا سبب بیان کیا ہے۔

جوا (قمار) کی تعریف:

جہاں تک قمار، میسر، جوا وغیرہ کا تعلق ہے تو قرآن وحدیث میں قمار، جوا وغیرہ کے تعلق سے جو صراحت ہے وہ مندرجہ ذیل ہے:

ا۔ جوا کے متعلق احادیث میں بھی بڑی مذمت آئی ہے، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

''**من قال لصاحبه: تعال أقامرک فليتصدق**'' (صحیح البخاری: کتاب التفسیر/۴۸۶۰)۔

(جو شخص اپنے ساتھی سے کہے کہ آؤ! تمہارے ساتھ جوا کھیلوں تو اسے صدقہ دینا چاہئے)۔

اس حدیث مبارک میں نہ صرف جوا کھیلنے، بلکہ اس کی دعوت دینے کے عمل کو بھی اس قدر بدتر قرار دیا ہے کہ انسان کو اس سے معافی کے لئے صدقہ دینا چاہئے۔

حضرت ابن عباسؓ سے سفید، سبز اور سرخ مٹکے کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ اس کے متعلق نبی ﷺ سے سب سے پہلے بنو عبد القیس کے وفد نے سوال کیا تھا، انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں یہ تلچھٹ حاصل ہوتا ہے، ہمارے لئے کون سے برتن حلال ہیں؟ نبی ﷺ نے فرمایا: دباء، مزفت، نقیر اور حنتم میں کچھ بھی نہ پیو، البتہ مشکیزوں میں پی سکتے ہو، پھر فرمایا کہ اللہ نے شراب، جوا اور کوبہ کو حرام قرار دیا ہے، اسی طرح ہر نشہ آور چیز حرام ہے، سفیان کہتے ہیں کہ میں نے علی بن بذیمہ سے کوبہ کا معنی پوچھا تو انہوں نے اس کا معنی طبل بتایا (سنن ابی داؤد: کتاب الاشربہ/۳۶۹۶)۔

خلاصہ یہ کہ حضور اکرم ﷺ نے ان تمام تجارتی معاملات کو ممنوع بتایا ہے جس میں جوا اور قمار پایا جاتا ہو۔

جوا جسے عربی زبان میں ''قمار'' کہا جاتا ہے، درحقیقت ہر وہ معاملہ ہے جس میں ''مخاطرہ ہو''۔ یعنی قمار کی حقیقت یہ ہے کہ ایسا معاملہ کیا جائے جو نفع ونقصان کے خطرے کی بنیاد

پر ہو۔ علامہ علی بن محمد الشریف الجرجانی (المتوفی ۸۱۶ھ) اپنی کتاب ''التعریفات'' میں لکھتے ہیں :''القمار :هو أن يأخذ من صاحبه شيئًا فشيئًا في اللعب'' اسی طرح ''القمار :في لعب زماننا :كل لعب يشترط فيه غالباً من المتغالبين شيئًا من المغلوب'' (ہر وہ کھیل جس میں یہ شرط ہو کہ مغلوب (یعنی ناکام ہونے والے) کی کوئی چیز غالب (کامیاب ہونے والے) کو دی جائے گی قمار کہلاتا ہے)۔

یعنی زیادہ مال کی لالچ میں اپنے مال کو اس طرح خطرے میں ڈالنا کہ دونوں جانب مال ہو اور اس میں محنت کا کوئی دخل (کوئی عمل) نہ ہو، کیوں کہ قمار (جوا) میں معاملہ نفع وضرر کے درمیان دائر ہوتا ہے اور احتمال یہ بھی ہوتا ہے کہ بہت سا مال مل جائے گا اور یہ بھی کہ کچھ نہ ملے، اسی کو ''مخاطرہ'' اور قرآن کی اصطلاح میں ''میسر'' کہتے ہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''يا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمنُوا إنَّمَا الخمرُ وَالمَيْسِرُ والأنصابُ والأزلامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطانِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ'' (مائدہ:۹۰)۔

(اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں اور شیطانی کام ہیں، سو ان سے بالکل الگ ہو جاؤ تا کہ تم کو فلاح پا جاؤ) (بیان القرآن)۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ جوئے کے بارے میں ارشاد ربانی ہے:

''يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا إِثْمٌ كَبِيرٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِن نَّفْعِهِمَا وَيَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ'' (سورہ بقرہ:۲۱۹)۔

(لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں، فرما دیجئے ان دونوں میں بہت بڑا گناہ ہے اور لوگوں کو اس سے (کبھی) دنیاوی فائدہ بھی ہوتا ہے لیکن ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔ تم سے یہ بھی دریافت کرتے ہیں کیا کچھ خرچ کریں؟ تو آپ فرما دیں اپنی ضرورت سے زائد چیز خرچ کرو۔ اللہ تعالیٰ اس طرح تمہارے لیے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے تا کہ تم سوچ سمجھ سکو)۔

قرآن میں جوئے کو ''میسر'' کہا گیا ہے، اور دراصل میسر کے معنی ہیں سہولت یا آسانی میسر کا لفظ یسر سے ہے، تو ہر وہ کھیل جس میں آسانی وسہولت سے کچھ حاصل ہونے یا کھونے کی توقع ہو اسے میسر کہیں گے۔

اور اگر اس کھیل میں مادی طور پر کچھ کھونے یا پانے کا معاملہ نہ ہو، بلکہ محض وقت کا ضیاع اور دینی ودنیوی فرائض سے غفلت کا سبب بنے تو ایسا کھیل بھی ''میسر'' ہی کہلائے گا۔

حضور ﷺ نے فرمایا: جس نے نَردشَیر سے جُوا کھیلا تو گویا اُس نے اپنا ہاتھ خنزیر کے گوشت اور خون میں ڈبویا (ابن ماجہ ۴/۲۳۱، حدیث: ۳۷۶۳) سؤر کے گوشت وخون میں ہاتھ سا ننا اِسے نجس بھی کرتا ہے اور گھناؤنا عمل بھی ہے اس لئے اس سے تشبیہ دی گئی (مراۃ المفاتیح ۶/۲۰۳)۔

اسی طرح آپ نے فرمایا جو کوئی نَرد کھیلے اس نے اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کی (مسند بزار ۸/۷۷، حدیث: ۳۰۷۵)۔

ایک اور حدیث میں ہے جو شخص نَرد کھیلتا ہے پھر نماز پڑھنے اٹھتا ہے، اس کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو پیپ اور سور کے خون سے وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے (مسند امام احمد ۹/۵۰، حدیث: ۳۳۱۹۹)۔

میسر مصدر ہے اور اصل لغت میں اس کے معنی تقسیم کرنے کے ہیں، یا سر تقسیم کرنے والے کو کہا جاتا ہے، جاہلیت عرب میں مختلف قسم کے جوئے رائج تھے، جن میں ایک قسم یہ بھی تھی کہ اونٹ ذبح کر کے اس کے حصے تقسیم کرنے میں جوا کھیلا جاتا تھا، بعض کو ایک یا زیادہ حصے ملتے اور اور بعض محروم رہتے تھے، پھر محروم رہنے والے کو پورے اونٹ کی قیمت ادا کرنا پڑتی تھی اور گوشت سب فقراء میں تقسیم کیا جاتا، خود استعمال نہ کرتے تھے۔

اس خاص جوئے میں چونکہ فقراء کا فائدہ اور جوا کھیلنے والوں کی سخاوت بھی تھی، اسی لئے اس کھیل کو باعث فخر سمجھتے تھے، جو اس میں شریک نہ ہوتا اس کو کنجوس اور منحوس کہتے تھے۔

اسی تقسیم کی مناسبت سے قمار کو میسر کہا جاتا ہے، تمام صحابہ کرامؓ وتابعین اس پر متفق ہیں کہ میسر میں قمار یعنی جوئے کی تمام صورتیں داخل ہیں اور سب حرام ہیں، ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اور جصاص نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس، ابن عمر اور قتادہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اسی طرح معاویہ بن صالح، عطاء اور طاؤس نے فرمایا:

"**المیسر القمار حتی لعب الصبیان بالکعاب والجوز**" (یعنی ہر قسم کا قمار میسر ہے یہاں تک کہ لکڑی کے گٹھلوں اور اخروٹ وغیرہ کے ساتھ بچوں کے کھیل بھی)۔

اور ابن عباسؓ نے فرمایا: "**المخاطرة من القمار**" یعنی مخاطرہ قمار میں سے ہے (جصاص)، ابن سیرین نے فرمایا: جس کام میں مخاطرہ ہو وہ میسر میں داخل ہے (روح البیان)۔

قرآن میں ہے:

"**إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون**" (سورۃ المائدہ: ۹) (شراب، جوا، شرک کے لئے نصب کئے گئے بت اور قسمت آزما تیر، یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، ان سے پرہیز کرو، امید ہے کہ تمھیں کامیابی نصیب ہو)۔

جوئے کی شکلیں:

۱۔ تمام وہ معاملات اور خرید وفروخت جو رزک، یا جو خطرے کی بنیاد پر ہو، یعنی ان کا وقوع یا عدم وقوع اور ان سے منافع کا حصول اور عدم حصول موہوم ہو۔ امام جصاص کہتے ہیں:

جوئے کی حقیقت مال کا خطرے کے ساتھ مالک ہونا ہے، مثلاً صدقات، خرید وفروخت کے معاملات یا ہبہ وغیرہ کو خطر پر موقوف رکھے، جیسے یوں کہے: میں تم کو بیچوں گا جب زید آئے گا، "**بعتک إذا قدم زید**"، میں اس کو ہبہ کروں گا عمرو کے نکلنے پر "**وھبتہ إذا خرج عمرو**" (احکام القرآن للجصاص، نھی عن ھذا فقال إنما نھی عنہ للعوز فی ذلک ۴/۱۲۷)۔

۲۔ ہر وہ کھیل جو مال کے ساتھ مشروط ہو۔
۳۔ جن عقود میں دھوکہ اور غرر ہو وہ بھی قمار اور جوئے میں داخل ہیں۔

جوئے وقمار کے سماجی اور اجتماعی نقصانات (شریعت کے منع کردہ معاملات اور منع کرنے کی حکمتیں ومصلحتیں) :

قمار یعنی جوئے کے متعلق بھی قرآن کریم نے وہی ارشاد فرمایا، جو شراب کے متعلق آیا ہے کہ اس میں کچھ منافع بھی ہیں مگر نفع سے اس کا نقصان وضرر بڑھا ہوا ہے، اس کے منافع کو تو ہر شخص جانتا ہے کہ جیت جائے تو بیٹھے بیٹھے ایک فقیر وبدحال آدمی ایک ہی دن میں مالدار اور سرمایہ دار بن سکتا ہے، مگر اس کی معاشی، اجتماعی، سماجی اور روحانی خرابیاں اور مفاسد بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

اس کا اجمالی بیان یہ ہے کہ جوئے کا کھیل سارا کا سارا اس پر دائر ہے کہ ایک شخص کا نفع دوسرے کے ضرر پر موقوف ہے، جیتنے والے کا نفع ہی نفع اور ہارنے والے کا نقصان ہی نقصان ہوتا ہے، کیونکہ اس کاروبار سے کوئی دولت بڑھتی نہیں وہ اسی طرح منجمد حالت میں رہتی ہے، اس کھیل کے ذریعہ ایک کی دولت سلب ہو کر دوسرے کے پاس پہنچ جاتی ہے، اس لئے قمار مجموعی حیثیت سے قوم کی تباہی اور انسانی اخلاق کی موت ہے، کہ جس انسان کو نفع رسانی، اخلاق اور ایثار وہمدردی کا پیکر ہونا چاہئے وہ ایک خونخوار درندہ کی خاصیت اختیار کرے کہ دوسرے بھائی کی موت میں اپنی زندگی، اس کی مصیبت میں اپنی راحت اور اس کے نقصان میں اپنا نفع سمجھنے لگے اور اپنی پوری قابلیت اس خودغرضی پر صرف کرے، بخلاف تجارت اور بیع وشراء کی جائز صورتوں کے کہ ان میں طرفین کا فائدہ ہوتا ہے اور بذریعہ تجارت اموال کے تبادلہ سے دولت بڑھتی ہے اور خریدنے اور بیچنے والے دونوں اس کا فائدہ محسوس کرتے ہیں۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے بیع غرر (دھوکہ دہی کی بیع اور خرید وفروخت) سے بھی منع فرمایا :"عن بيع الحصاة وعن بيع الغرر" (مسلم: باب بطلان بیع الحصاۃ والبیع

الذی فیہ، حدیث: ۱۵۱۳)۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے بے شمار خرید وفروخت کو صرف اس میں دھوکہ دہی کی وجہ سے منع فرمایا، جس میں "**بیعتین فی بیعة**" (دوسرے کی بیع میں بیع)، بیع حصاۃ (سامان پر کنکری مارنے سے سامان کی تعین کی بیع)، بیع ملامسہ (چھونے کی بیع)، بیع منابذہ (پھینکنے کی بیع)، بیع مضامین (فحل کے صلب میں موجود نطفہ کی بیع)، ملاقیح (یعنی اناث کے پیٹ میں موجود بچے کی بیع)، بیع مزابنہ (درخت کھجور پر موجود کھجور کی تولے ہوئے کھجور سے بیع)، بیع محاقلہ (تولے ہوئے غلے کی کھیت میں بالی پر موجود غلے سے بیع)، بدوصلاح (پھل میں پختگی ظاہر ہونے) سے پہلے پھل کی بیع وغیرہ، یہ سارے بیع غرر ہیں۔

اس کے علاوہ قمار اور جوے کی حرمت پر صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور فقہاء ومحدثین کا اتفاق ہے، چنانچہ ابوبکر جصاص رازی فرماتے ہیں:

"**ولا خلاف بین أهل العلم فی تحریم القمار وأن المخاطرة من القمار**"

(ترمذی: باب ماجاء فی الیخیل، حدیث: ۱۹۶۳، امام ترمذی نے اس روایت کو حسن غریب کہا ہے)۔

"جوئے کی حرمت کے تعلق سے اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے اور "مخاطرہ" (یعنی جس معاملہ میں ہار جیت دونوں کا امکان ہو) وہ بھی جوا ہے"۔

شریعت نے غبن، قمار، تدلیس، میسر، کوبہ وغیرہ سے جو ممانعت فرمائی ہے اس سے صرف اور صرف مقصد یہ ہے کہ ان تمام ناجائز راستوں کو بند کر دیا جائے جس سے قباحتیں پیدا ہوں یا ہونے کا امکان موجود ہو، اسی کو سد ذرائع بھی کہتے ہیں، جس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ ان تمام راستوں کو بند کر دیا جائے اور ان تمام وسائل وذرائع کی حوصلہ شکنی کی جائے جن کے نتیجے نتیجے میں برائیاں جنم لیں اور جو برائی کو پھیلانے کا ذریعہ بنیں، اسی لئے ذخیرہ اندوزی، ناجائز منافع خوری، اسمگلنگ، حرام آمدنی، دھوکہ دہی، فریب اور اس طرح کی تمام خرابیوں کا راستہ اور ان راستوں کو کھولنے کے ذرائع پر شریعت نے پابندی لگادی، یہاں تک کے فقہاء اسلام نے ایک قاعدہ کلیہ اس تعلق سے وضع کیا ہے: "**دفع المفاسد أولی من جلب المصالح**"

کہ پہلے مرحلے کے طور پر جو خرابیاں ہیں ان کو دور کیا جائے، دوسرے مرحلے میں جو فوائد یا مصالح ہیں ان کو حاصل کیا جائے، مصلحت کو حاصل کرنے کے لئے خرابی کو دور کرنا ضروری ہے، کوئی بہتری اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتی جب تک کہ خرابی کو دور نہ کیا جائے۔

حدیث میں ہے کہ جو لوگ خریداروں کو گمراہ کرنے کے لئے مصنوعی خریدار پیدا کرتے ہیں اور مصنوعی طور پر سودے کی قیمت بڑھاتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ایسے لوگوں کو دھوکہ باز قرار دیا ہے، انھیں خائن بتایا ہے اور بالواسطہ سود خور بھی قرار دیا ہے (مؤطا امام مالک: کتاب البیوع ر ۱۹۹۴ تا ۱۹۹۸)، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص مصنوعی طور پر قیمتوں میں اضافے کی خاطر بولیاں نہ لگائے (سنن الترمذی: ابواب البیوع ر ۱۳۰۴)۔ یہاں تک کہا گیا ہے کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والے اور ناجائز قتل کرنے والے ان دونوں کو روز قیامت ایک ساتھ اٹھایا جائے گا (کنز العمال: کتاب البیوع ر ۹۷۳۹)، اس لئے کہ جو ذخیرہ اندوزی کرتا ہے وہ وسائل رزق سے لوگوں کو محروم رکھتا ہے، اور وسائل رزق سے محرومی موت کا سبب ہے، اور قاتل بھی موت کا ذریعہ بنتا ہے، اس لئے بالآخر نتیجے کے اعتبار سے دونوں کی نوعیت ایک ہی ہے، اس لئے ان دونوں کو قیامت میں ایک ساتھ اٹھایا جائے گا۔

مطلب یہ کہ اس کے ذریعہ سے ایک غیر انسانی رویہ اور استحصالی مزاج پیدا ہوجاتا ہے، اس لئے حدیث میں فرمایا گیا کہ "**الجالب مرزوق والمحتکر ملعون**" (سنن ابن ماجہ: کتاب التجارات ر ۲۱۵۳) (وہ شخص جو بازار میں پیداوار لے کر آتا ہے اور نیا نیا مال سپلائی کرتا ہے وہ اللہ کی طرف سے رزق کا مستحق ہے، اس کو رزق عطا کیا جائے گا، اس کے رزق میں برکت دی جائے گی اور جو ذخیرہ اندوزی کرتا ہے وہ خلق خدا کو محروم رکھتا ہے، اس پر اللہ کی لعنت ہوتی ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص مسلمانوں کی ضروریات کی چیزیں خاص طور پر کھانے پینے کی چیزوں کی ذخیرہ اندوزی کرتا ہے تو اللہ تعالی اس کو جذام وافلاس میں مبتلا کردیتا ہے (سنن ابن ماجہ: کتاب التجارات ر ۲۱۵۵)۔

اسی لئے احادیث میں تاجروں کو جو ہدایات دی گئی ہیں، بعض چیزوں سے روکا گیا ہے اس کی وجہ ضرر اور ظلم ہے، یعنی جس چیز سے روکا گیا ہے اس سلسلہ میں شریعت کا مقصد بالکل واضح اور ظاہر ہے، کسی حدیث میں کسی چیز سے روکا گیا ہے تو اس کا مقصد ضرر اور ظلم کو روکنا ہے، ضرر سے کیا مراد ہے؟ ضرر سے مراد ہر وہ نقصان ہے جو کسی شخص کو دوسرے کے طرز عمل سے پہنچے اور اس کا حق متاثر ہو، قرآن کریم اور احادیث میں جگہ جگہ ضرر کی ممانعت آئی ہے، بلکہ ایک مشہور حدیث تو قاعدہ فقہیہ کی حیثیت رکھتی ہے :"**لا ضرر و لا ضرار فی الإسلام**" (سنن ابن ماجہ: کتاب الاحکام/ ۲۳۴۰) (نہ تم کسی کو ضرر پہنچاؤ اور نہ بدلے میں کوئی تمھیں ضرر پہنچائے)۔

معاملات میں ضرر کا دخل:

ضرر کا بڑا دخل معاملات میں ہوتا ہے، اگر تاجر شریعت کے احکام کی پابندی نہ کرے، یا جہاں شریعت کے احکام کی پابندی نہ ہو رہی ہو وہاں دوسرے فریق کو ضرر و نقصان کے پہنچنے کے غالب امکانات پیدا ہو جائے گا اور جب اس کو ضرر پہنچے گا تو بدلے میں وہ آپ کے ساتھ ضرر کا معاملہ کرلے گا، اس لئے کوئی ایسا طرز عمل اختیار نہیں کرنا چاہئے جس سے دوسرے فریق کو ضرر یا نقصان پہنچنے کا امکان ہو، اس لئے کہ جب بھی کسی کو نقصان پہنچے گا تو وہ ظلم سمجھا جائے گا اور آپ ظلم کے مرتکب قرار پائیں گے۔

احادیث میں تاجروں کو قسمیں کھانے سے منع کیا گیا ہے کہ چیز بیچنے والا اپنی چیز فروخت کرنے کے لئے بار بار قسمیں نہ کھائے (صحیح مسلم: کتاب المساقاۃ/ ۱۶۰۷) کہ وہ تھوڑی سی آمدنی کے لئے اللہ کے بابرکت نام کو بیچ میں لائے، کیوں کہ ایک تو یہ کسی مسلمان کے شایان شان نہیں ہے دوسرے شریعت کے بھی منافی چیز ہے، قرآن میں بھی اس تعلق سے منع کیا گیا ہے اور یہ ممانعت سبھی قسموں کے تعلق سے بھی ہے (المائدہ:۸۹)۔

جھوٹی قسموں کے تعلق سے تو بہت سخت وعیدیں آپ ﷺ نے فرمائی ہیں، یہ

کبیرہ گناہ تو ہے ہی، ساتھ ساتھ اس کے نتیجے میں انسان برکت سے بھی محروم ہوجاتا ہے، پھر یہ کہ یہ دھوکہ بھی ہے کہ جھوٹی قسمیں کھا کر تاجر اس کا اصل وزن، اصل مقدار، اور اصل مالیت چھپائے یا یہ کہ بازار میں جو رائج الوقت بھاؤ ہے اس کو خریدار سے چھپائے۔

اسی طرح اس میں ''ضرر'' بھی ہے کہ اگر کوئی کسی خریدار سے ایسا سودا فروخت کردے جو اس کی توقع کے مطابق نہ ہو، لیکن آپ اسے باور کرادیں کہ یہ اس کی توقع کے مطابق ہے۔

اسی لئے تجارت جس شئی کی ہونی چاہئے، یا جو چیز بیچی جارہی ہے یا تجارت جس مال کی ہونی ہے، ایک مسلمان تاجر کی ذمہ داری بنتی ہے کہ اس سلسلہ میں شریعت کے احکامات وہدایات کو معلوم کرے جیسے کہ وہ چیز ناپاک نہ ہو، مال متقوم ہو، یعنی شریعت اس کو مال تسلیم کرتی ہو، جس شخص کی طرف سے اسے بیچا جارہا ہے، وہ چیز مکمل طور پر اس کی ملکیت میں ہو، جو شخص کوئی چیز بیچ رہا ہے وہ اس چیز کے ادا کرنے پر پوری طرح قادر ہو، اور جو چیز فروخت کررہا ہے وہ موجود ہو، یا اس وقت اگر موجود نہیں ہے تو اس کو اتنی قدرت ضرور حاصل ہو کہ اس چیز کو بروقت حاصل کیا جاسکے، یعنی مارکٹ میں (Available) ہو اور اس کو بہ آسانی خریدا جاسکے، اگر کسی شخص نے کوئی چیز خریدی ہے تو جب تک اس کے قبضے میں نہ آجائے اس وقت تک وہ اسے آگے فروخت نہیں کرسکتا، جیسا کہ حدیث میں ہے: ''**نهى رسول الله ﷺ عن بيع ما لم يقبض**'' (سنن النسائی: کتاب البیوع/ ۴۶۰۳) جو چیز ابھی تک خریدار کے قبضے میں نہیں آئی، اس کی فروخت قبضے سے پہلے جائز نہیں ہے، کیوں کہ جو چیز بیچی جارہی ہے، اور آئندہ کسی تاریخ کو ادا کی جائے گی تو اس کی مقدار، اس کے اوصاف، اس کی نوعیت، تمام چیزیں واضح اور مکمل طور پر معلوم ہونی چاہئیں۔

اسی طرح شریعت نے ایسی بیع سے منع فرمایا ہے جس میں دو متناقض معاملات لین دین کو اس طرح ملادیا جائے کہ ایک کی تکمیل دوسرے پر موقوف ہو، اس کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے، وجہ اس کی ممانعت کی یہ ہے کہ اس سے سود اور ربا کا راستہ کھل جائے گا۔ مثال

کے طور پر کوئی شخص کسی کے ساتھ معاملہ کرے اور اس سے یہ کہے کہ میں فلاں چیز بیچنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ آپ مجھے اتنا قرضہ دیں، یا یہ کہ میں آپ کو قرضہ دینے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ آپ میری فلاں چیز خرید لیں یہ جائز نہیں ہے کیوں کہ یہ دونوں دو الگ الگ معاملات ہیں، جب دونوں کو ایک دوسرے پر موقوف کر دیا جائے گا تو اس سے ناجائز تجارت وکاروبار اور سودخوری کا راستہ کھلے گا اور شریعت نے ہر اس چیز سے جس سے سود کا کوئی بھی راستہ کھلنے کا امکان ہو سختی سے منع کیا ہے۔

مزید یہ کہ اسی طرح کی شرائط سے بالواسطہ سودی آمدنی کا ایک راستہ کھلتا ہے، چاہے کسی کی نیت سودی کاروبار کی نہ ہو، کیوں کہ اس وقت تو بے شک سودخوری کی نیت نہیں ہے لیکن اگر یہ کاروبار جائز قرار دے دیا جاتا اور یہ راستہ کھل جاتا تو سود کھانے والے اس راستے کو اختیار کر لیتے، اسی طرح معاملات میں بعض دفعہ ادھار کی نوبت آجاتی ہے کیوں کہ بعض اوقات سامان کی یا دیگر دوسری چیزوں کی انسان کو ضرورت پڑ جاتی ہے، تو انسان اپنی ضرورت میں کسی دوسرے انسان سے مانگ کر یا ادھار لے کر پوری کر لیتا ہے، لیکن کبھی کبھار ہوتا یہ ہے کہ مہلت ومدت طے نہ ہونے کی صورت میں نزاع کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے اور پھر یہ بڑی شدت اختیار کر لیتا ہے۔

یہی نہیں بلکہ لوگ مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں، معاملات میں اس طرح کے جو اختلافات رونما ہوتے ہیں وہ اکثر معاملات میں ابہام وصفائی اور وضاحت کے نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، یہاں تک کہ قرآن میں سورہ بقرہ کی ۲۸۲ ویں آیت میں اسی نزاع سے بچنے کے مقصد سے کہا گیا ہے کہ خرید وفروخت کے ادھار ہونے کی صورت میں اسے تحریراً لکھو، بلکہ نقد ہو تب بھی لکھ لیا کرو، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے قرض وادھار کی تمام صورتوں کے بارے میں اصولی بات فرمائی ہے کہ ادائیگی کی مدت واضح اور متعین ہونی چاہئے کوئی شخص کہے کہ کھیت کی کٹائی یا فلاں شخص کے دینے تک کے لئے ادھار ہے تو

اس کا اعتبار نہیں؛ بلکہ مدت یا ادائیگی کا وقت کسی ابہام کے بغیر مقرر ہونا چاہئے۔

''لا نسلف فی العطاء ولا فی الحصاد واضرب أجلا'' (اعلاء السنن ۱۴/۳۸۱)

(استحصال کی صورتوں میں سے یہ بھی ہے کہ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجبور آدمی کو من مانی قیمت پر کوئی چیز بیچنے پر مجبور نہ کرو، اس طور پر کہ کوئی شخص مجبوری میں اپنی کوئی قیمتی چیز بیچنا چاہتا ہے اور آپ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر کہ میں پانچ سو روپے کی چیز سو روپے میں لوں گا، اس لئے کہ یہ ''ولا تبخسوا الناس أشیاءھم'' (سورہ ہود: ۸۵) میں آتا ہے یعنی لوگوں کے مال یا لوگوں کی چیزوں اور ملکیتوں کی قیمت کم نہ کرو، ان کو نقصان نہ پہنچاؤ، لہذا ایسی وہ تمام صورتیں جس میں عوام الناس کا استحصال ہو رہا ہو، یا دھوکہ ہو رہا ہو، آپ نے منع فرمایا ہے۔

اس سے رسول اللہ ﷺ کا منشا یہ تھا کہ بدعنوانیوں اور نفع خوری کے تمام چور دروازوں پر قدغن لگنا چاہئے، اسی لئے ضروری ہے کہ اشیاء صرف بازار میں کھلے طور پر دستیاب ہوں اور وہ اپنے حقیقی نرخ پر فروخت ہوں، کوئی بیرونی قوت اور مفاد پرست عناصر اشیاء کی اصل قیمت پر اثر انداز نہ ہو، اور بازار پر کسی مخصوص گروپ کا اس طرح کا کوئی تسلط نہ ہو کہ وہ من مانے طور پر جو چاہیں کریں، دراصل کبھی قدرتی عوامل کی وجہ سے بعض اشیائے صرف کی قلت ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی مفاد پرست عناصر زیادہ نفع کمانے کے لئے ذخیرہ اندوزی کے ذریعہ چیز کو بازار سے اٹھا کر گوداموں میں جمع کر کے مصنوعی قلت پیدا کر دیتے ہیں، اس طرح اشیاء کی رسد کم اور طلب بڑھ جاتی ہے، اس کا نقصاندہ پہلو یہ ہے کہ اس سے گرانی میں اضافے کے ساتھ ساتھ چور بازاری کا دروازہ بھی کھل جاتا ہے، اسی طرح وہ چیزیں جنھیں زیادہ دنوں تک روکا نہیں جا سکتا، ایسی چیزوں کو کچھ سرمایہ دار ضائع کر کے قلت پیدا کرتے ہیں اور مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ گراں قیمت پر فروخت کر کے اسے زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کیا جائے، یہ ایک غیر فطری عمل ہونے کے ساتھ ساتھ اسوۂ رسول کے مطابق ''اتلاف مال'' میں شامل ہے، اس تعلق سے سیرت رسول ﷺ میں واضح ہدایات ہیں کہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کی ناقدری نہ کی جائے۔

اسی طریقے سے احادیث میں ''تلقی جلب''، ''لایبیع حاضر للباد''، ''بیع الحاضر للبادی'' وغیرہ الفاظ واصلاحات کے ذریعہ لوگوں کے مختلف حربوں اور بیجا مداخلتوں کے ذریعہ مارکٹ میں اپنی اجارہ داری قائم کرنے کے طریقے کو منع کر دیا گیا اور اسوۂ رسول کے ذریعہ ان تمام نام نہاد راستوں اور ذرائع اور وسائل پر جن میں ضرر واضرار کا ذرا بھی شائبہ ہے، روک لگادی گئی تا کہ بازار کا اپنا طبعی نظام قائم رہے اور ہر شخص کی کھلی منڈی میں یکساں طور سے رسائی ہو سکے، یہ وہ اہم اصلاحات ہیں جن کے نفاذ کے پس منظر میں اگر چہ مدینہ کے یہودیوں کی بازاروں میں اجارہ داری، اشیاء صرف کی ذخیرہ اندوزی، نفع خوری، اور سودی لین دین کی مذموم ذہنیت اور ان کے غیر اخلاقی طور طریقے پیش نظر رہے ہیں لیکن فرمان رسول کی جامعیت اور ہمہ گیری دیکھیں کہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی یہ ہدایات واصلاحات انسانیت کی فلاح اور اخلاقی قدروں پر مبنی معاشی نظام کا ستون سمجھی جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ بازار تشریف لے گئے، غلے کے ایک ڈھیر میں ہاتھ ڈال کر دیکھا تو وہ اندر سے گیلا نکلا، دوکاندار سے اس کی وجہ دریافت کی، اس نے بتایا کہ بارش سے بھیگ گیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو اوپر کیوں نہ رکھا تا کہ لوگوں کو نظر آتا، پھر آگاہ فرمایا کہ ''**من غش فلیس منا**'' جو دھوکہ دے وہ ہم میں سے نہیں (صحیح مسلم: کتاب الایمان/ ۱۰۲)۔

اسلام یا اسوۂ رسول کے ذریعہ آپ ﷺ دنیا کو جس معاشی اور تجارتی نظام سے متعارف کرانا چاہتے تھے اس سے متعلق آپ ﷺ کی یہ خواہش تھی کہ اس میں صداقت، امانت، شفافیت، معیار بندی، اخلاقی قدریں، اور آخرت کی جواب دہی کا عنصر غالب ہو، اس لئے کہ اس نظام کے تحت تجارت صرف تجارت نہیں بلکہ عبادت بھی ہے اور یہی اس نظام کا امتیازی پہلو ہے اور شریعت کا منشا ومقصود بھی یہی ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ تاجر قافلے کے سامنے نکلنے یا کسانوں سے سامان خریدنے میں اگر ان کو دھوکہ دیدے، یا قحط کی صورت میں شہریوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھائے، یا سامان کو

ذخیرہ کر کے قیمتوں کے اتار چڑھاؤ پر اثر ڈالے تو ان تینوں صورتوں میں بے جا نفع خوری کا عنصر موجود ہے، لہٰذا اس کی وجہ سے نبی کریم ﷺ نے اس بارے میں انتہائی سختی سے منع فرمایا ہے، چنانچہ سیدنا جابرؓ کی روایت میں منقول ہے :"**لا یبیع حاضر لباد، دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم من بعض**" (مسلم: کتاب البیوع/ ۱۵۲۲)۔

شہری دیہاتی کے لئے بیع نہ کرے، لوگوں کو چھوڑ دو کہ اللہ بعض کو بعض دوسرے کے رزق کا باعث بنا دے، ایک اور روایت میں اس طرح کے الفاظ وارد ہیں:

"**عن أنس بن مالک قال :نھینا أن یبیع حاضر لباد وإن کان أخاہ أو أباہ**"

(انسؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ شہری کو دیہاتی کے لئے بیع سے ہمیں منع کیا گیا ہے، اگرچہ دیہاتی اس کا بھائی یا باپ کیوں نہ ہو) (مسلم: کتاب البیوع/ ۱۵۲۳)، اس کے مقابلے میں اگر اس عمل سے تاجر مذکورہ تینوں صورتوں میں سے کسی صورت کا باعث نہ بنے تو اس بیع کے جواز میں کوئی شک نہیں ہے۔

خلاصہ یہ کہ ضرر اور ضرار دونوں ممنوع ہیں، سیدنا ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کسی کو نہ ابتداءً نقصان پہنچایا جائے اور نہ بدلے میں (ابن ماجہ: کتاب الاحکام/ ۲۳۴۰)۔

مذکورہ حدیث دین اسلام کے اصول میں معدود ہے، چنانچہ فقہاء نے اس کی بنیاد پر کئی فقہی احکام کا استنباط کیا ہے، علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں: اس حدیث کی تفسیر یہ ہے کہ انسان اپنے (مسلمان) بھائی کے لئے ابتداءً یا جزاءً (بدلہ یا انتقام میں زیادتی کی صورت میں) نقصان کا باعث نہ بنے۔ (مبیع میں) عیب کے وجود کی وجہ سے بیع کی تردید، بیع میں تمام قسم کے خیارات اور تمام قسم کی پابندیاں اس کے تحت داخل ہیں، اسی طرح شفعہ، شریک کے حق میں تقسیم کے ضرر سے بچنے کے لئے، اور ہمسایہ کے حق میں برے ہمسایہ سے بچنے کے لئے ثابت ہے، کیونکہ ہمسایگی کی وجہ سے گھروں کی قیمت میں اتار چڑھاؤ آتا ہے۔

اسی طریقے سے احادیث میں غیر مملوکہ اشیاء کی خرید وفروخت کی ممانعت آئی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "**عن ربح مالم یضمن**" (نسائی: کتاب البیوع ۴۶۳۱/) (نبی ﷺ نے منع فرمایا ہے اس چیز کا نفع لینے سے جس کا تاوان یا جس کا ضمان تمہارے ذمہ نہیں ہے)، یعنی جو چیز خریدار کے قبضہ میں نہ ہو اس کے ٹوٹنے یا ضائع ہوجانے کی صورت میں تاوان کی ذمہ داری خریدار کی نہیں ہے اور جب کوئی ذمہ داری نہیں ہے تو اس کا نفع لینے کا حق بھی خریدار پر نہیں ہے، جیسا کہ ایک مشہور حدیث میں ہے: "**الخراج بالضمان**" (ابوداؤد: کتاب الاجارہ/ ۳۵۰۸) جس میں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ جس چیز کے ٹوٹ پھوٹ جانے کے نقصانات کے آپ ذمہ دار ہیں اور آپ اس کے اخراجات برداشت کرنے کے پابند ہیں، اسی چیز کا نفع بھی آپ لے سکتے ہیں، اس سے شریعت کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کا استحصال نہ ہو، ایسا نہ ہو کہ نقصان بھی برداشت نہ کرے اور نفع بھی اٹھائے۔

"**عن ابن عمر رضی اللہ عنہما أن النبی ﷺ قال: من ابتاع طعاماً فلا یبعه حتی یستوفیه، زاد اسماعیل: من ابتاع طعاماً فلا یبعه حتی یقبضه**" (صحیح بخاری: کتاب البیوع ۲۱۳۶/)۔

(سیدنا ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ جس نے غلہ خریدا تو اسے پوری طرح وصول کرنے سے پہلے فروخت نہ کرے، اسماعیل نے (اس روایت میں یہ) اضافہ بھی کیا ہے کہ جس نے غلہ خریدا تو قبضہ سے پہلے اسے نہ بیچے)۔

یہ حکم صرف طعام (Food) تک محدود نہیں ہے بلکہ دوسرے مبیعات (Commodities) بھی اس میں داخل ہیں، چنانچہ سیدنا ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میرے خیال میں ہر چیز اس میں داخل ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے ہمیں ایک کلی اصول فراہم کردیا ہے کہ نقصان دینا ابتداءً وجزاءً دونوں صورتوں میں قابل برداشت نہیں ہے، جس کا اطلاق دوسرے اوامر کے مقابلے میں معاملات پر زیادہ ہوتا ہے، پھر جزوی طور پر ہر اس معاملے سے منع فرمایا جس میں ضرر دینے کا

عنصر موجود تھا، چنانچہ دھوکہ دہی اور وعدہ خلافی سے بچنے کے لئے قافلے کے راستہ میں نکلنے، معدوم چیز اور قبل از وصولی مبیع کی فروخت سے منع فرمادیا، ذخیرہ اندوزی کو حرام ٹھہرادیا، کیونکہ اس میں انسانیت کی مجبوری کا فائدہ اٹھایا جاتا ہے، اسی طرح ''بیعانہ'' سے منع فرمادیا جو کہ اخذ بلاعوض ہے، سود کے معاملے کو سختی سے روکا جو ایک صورت میں کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کا ہتھیار ہے تو دوسری صورت میں غریب کا پیسہ امیر کے جیب کی دھن بننے کا ذریعہ ہے۔

نتیجتاً ثابت ہوا کہ اسلام ہر اس معاملے کے خلاف ہے جو عدل وانصاف سے ہٹ کر ظلم کی طرف لے جانے کا راستہ ہے۔

۱۔ اسلامی نظام معیشت بہت سی خوبیوں اور کمالات کا مجموعہ ہے، جس کو دنیا کے دیگر معاشی نظام پر مکمل برتری حاصل ہے اور یہ ہر قسم کے مظالم وناانصافیوں سے پاک اور منصفانہ تقسیم دولت کا ضامن ہے۔

۲۔ اسلام نے انسان کو صرف ملکی قوانین کا پابند نہیں بنایا بلکہ اس کے ساتھ اخلاقیات کا ایک جامع نظام دیا ہے جس کا لحاظ معاملات کے ہر موڑ پر رکھنا ضروری ہے۔

۳۔ اسلام نے انسان کو سچائی، دیانتداری، نرمی اور تقوی وطہارت کی تعلیم دی ہے، جب کہ سود، رشوت، قمار، جھوٹ، دھوکہ دہی اور بددیانتی سے سختی سے منع کیا ہے کیونکہ اس کے مضر اثرات پورے معاشرے پر مرتب ہوتے ہیں۔

۴۔ برکت اور بے برکتی کے اسباب معلوم کر کے برکت والے اعمال کو اپنانا چاہئے تا کہ زندگی پرسکون ہو۔

۵۔ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ معیشت کے متعلق اسلامی ہدایات کو سمجھ کر اس پر عمل پیرا ہوجائیں اور انسان کی ناقص عقل سے بنے ہوئے نظاموں کے بجائے خالق کائنات کے دیئے ہوئے ہمہ گیر اور جامع نظام معیشت کی پیروی کریں اور اسی کو اپنے لئے دنیا وآخرت میں باعث ترقی ونجات سمجھیں۔

مقاصد شریعت کی تکمیل:

محمود احمد غازی کے بقول: ''جب ایک تاجر جائز طریقے سے تجارت کرتا ہے تو وہ تعمیری ومعاشی سرگرمی میں شریعت کے احکام کے مطابق حصہ لیتا ہے، گویا شریعت کے مقاصد کے تکمیل میں عملاً شریک اور حصہ دار بن جاتا ہے، اس کا اپنا پیشہ، اس کا اپنا روزگار اور اس کی ذاتی دلچسپی شریعت کے مقاصد سے اس حد تک ہم آہنگ ہوجاتی ہے کہ جہاں جائز روزی کا حصول، اسلامی معاشرے میں رزق حلال کی تلاش اور احکام شریعت کی پابندی، شریعت کے اہم مقاصد میں شامل ہے وہاں یہ چیزیں اس تاجر کے رویے کا حصہ بھی بن جاتی ہیں۔ اور یہ اس وقت ہے جب تاجر امین اور صدوق یعنی دیانت دار اور سچا ہونے کے ساتھ ساتھ احکام شریعت پر مکمل طور پر عمل درآمد بھی کرتا ہو اور احکام شریعت پر مکمل درآمد کے لئے ضروری ہے کہ وہ شریعت کے احکام کو جانتا اور سمجھتا ہو (محاضرات معیشت وتجارت/ ۲۳۲)۔

باب چہارم:

اسلامی مالیاتی نظام

اللہ تعالی نے فرمایا :"إن الدين عند الله الإسلام" (آل عمران: ۱۹) کہ اللہ کے نزدیک پسندیدہ دین اسلام ہے، اس آیت کریمہ سے اسلام کی فضیلت واہمیت معلوم ہوتی ہے کہ یہ اللہ تعالی کا محبوب وپسندیدہ دین ہے۔ اسلام ہی وہ دین ہے جس میں زندگی کے ہر شعبے سے منسلک افراد کے لئے رہنمائی موجود ہے۔

اسلام کا نظام معیشت:

اسلامی نظام معیشت سے مراد کسی منظم معاشرہ میں رہنے والے افراد کی معاشی ضروریات کی تسکین کا وہ طریق کار ہے جو قرآن وسنت کی ہدایات کے تابع ہو، ان ہدایات کے مطابق اس بات کا تعین کیا جاتا ہے کہ صرف دولت، پیدائش دولت اور تقسیم وتبادلہ دولت کا اندازہ کیا ہو۔ اس نظام میں افراد معاشرہ کی معاشی سرگرمیاں چند اقدار سے منضبط ہوتی ہیں، جن میں تقوی، عدل، احسان، تعاون، اخوت اور مساوات خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان اقدار کا منبع وماخذ قرآن پاک اور سنت رسول اللہ ﷺ ہے، جو کہ دائمی اور نا قابل تغیر ہے، صارف، آجر اور تاجر سب کے لئے ان اقدار کی پابندی لازم ہے۔

ا۔ مالک الملک حق تعالی شانہ ہے:

اسلام کے معاشی اور تجارتی اصولوں کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ زمین اور اس کی ساری اشیاء اللہ تعالی کی ملک ہیں، جائیداد منقولہ وغیر منقولہ کا حقیقی مالک صرف اللہ تعالی ہے، انسان کے ہاتھ میں ساری دولت اور سارا مال ومنال امتحان اور آزمائش کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے

جس کے ذریعہ اللہ تعالی اپنی مخلوق کی آزمائش کرتا ہے کہ کون اچھے مقصد اور صحیح اصول کے مطابق اس کو صرف کرتا، تقسیم کرتا اور اس کی پیداوار کو بڑھاتا ہے۔ اجیر ہو یا مستاجر، مزدور ہو یا مل کا مالک، کارخانہ دار ہو یا دکان دار ہر ایک کے پاس جو کچھ ہے یا ہر ایک کے ذمہ جو کام دیا گیا ہے، اس میں اسے اس طرح تصرف کرنا چاہئے کہ اللہ تعالی خوش ہو، اس کی مخلوق امن اور چین سے زندگی بسر کرے اور دنیا اور آخرت دونوں جگہ ان کی محنتوں کا اچھا ثمرہ ہاتھ آئے یہ تصور اسلامی اقتصادیات کا سنگ بنیاد ہے۔

۲۔ ہر شخص کو اکتساب رزق کے مواقع میسر ہیں:

اس کے بعد اسلام ہر شخص کے لئے جدو جہد کا مساوی حق تسلیم کرتا ہے، اس کے لئے مساوی مواقع کا اعلان کرتا ہے اور ان مساوی مواقع کی اپنی پوری سیاسی طاقت سے حفاظت کرتا ہے، چنانچہ جو لوگ ان حقوق کو استعمال کر کے زمین کی کسی شئی کو کارآمد بناتے ہیں چاہے وہ کسی قسم کا کاروبار ہو، اسلام اس پر ان لوگوں کا حق تصرف تسلیم کرتا ہے اور ان کو ان کا مالک قرار دیتا ہے، اس طرح اسلام میں ایک انسان کے مقابلہ میں دوسرے انسان کو صرف اصطلاح کے مطابق ''حق ملکیت'' حاصل ہوتا ہے، اسلام ایک شخص کو جو محنت کر کے کچھ دولت کماتا ہے اس دولت کا جائز مالک قرار دیتا ہے، لیکن چونکہ ساتھ ہی وہ اللہ تعالی کے مالک الملک ہونے کا نظریہ بھی پیش کرتا ہے اس لئے اسے اپنی ملکیت میں اپنی مرضی سے تصرف کا حق نہیں دیتا، بلکہ جائز اور ناجائز، مفید اور نقصان دہ، اور حلال وحرام کی قید لگا کر دولت کمانے کے متعدد ذرائع پر پابندی لگا دیتا ہے، دولت کو قابو میں رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ دولت صرف ایسے کاموں میں اور اس طرح صرف ہو کہ وہ مفید اور پیدا آور (Productive) بن جائے، غیر بارآور کاموں میں دولت کا صرف اسلام کے نزدیک اس کی تباہی کے مترادف ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز کوئی شخص اپنی جگہ سے ہل نہیں سکے گا جب تک اللہ تعالی کو پانچ سوالوں کا جواب نہ دے لے، ان میں سے دو سوال مال کے بارے میں ہیں کہ :''من أین

اکتسبه و فیما أنفقه'' (ترمذی) (کہ یہ مال اس نے کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اسلام نے حرام مال اور بے جا خرچ کرنے دونوں پر پابندی لگادی ہے، نہ کوئی فرد اپنی مرضی کے مطابق مال کما سکتا ہے اور نہ ہی خرچ کرسکتا ہے، یہ ایک بنیادی فرق ہے اسلامی معیشت میں اور غیر اسلامی معیشت میں، ہر غیر اسلامی نظام معیشت میں خواہ وہ اشتراکی نظام معیشت ہو یا سرمایہ دارانہ نظام معیشت ہو کسی فرد کے مال کمانے پر کوئی پابندی نہیں یہاں تک کہ عورت اگر اپنی عصمت فروخت کر کے بھی مال کماتی ہے تو وہ مال اس کی ملکیت میں ہوجاتا ہے جب کوئی جائز یا ناجائز طریقہ سے مال کماتا ہے تو اب اس کو خرچ کرنے کی بھی پوری آزادی ہے، چاہے تو نائٹ کلب میں اس مال کو خرچ کرے یا کسی اور ناجائز اور اخلاق باختگی کے طریقے سے اس کو صرف کرے کوئی اس کو روکنے والا نہیں، اس کے برعکس اسلام نے مال کے کمانے پر بھی مختلف پابندیاں لگائیں کہ وہ بلیک مارکیٹ سے مال نہیں کما سکتا، منشیات فروخت کر کے مال حاصل نہیں کرسکتا، کیونکہ اس سے قوم کی عملی صفات تباہ و برباد ہوتی ہیں اور قوم نشہ کی عادی ہو کر تباہی و بربادی کے دہانہ پر پہنچ جاتی ہے، لہذا کوئی شخص کسی ایسے کام میں مال خرچ نہیں کرسکتا جس سے قوم کے اخلاق برباد ہوں یا قوم میں کاہلی و سستی پیدا ہو، چنانچہ ہر اس طریقہ کو بھی اسلام نے ناجائز قرار دیا جس سے احتکار اور اکتناز پیدا ہو، اسلام کا مطالبہ یہ ہے کہ ''اجملوا فی الطلب'' کہ طلب میں اجمال اختیار کرو یعنی صرف مال کمانے کی مشین نہ بن جاؤ بلکہ اتنا کماؤ جس سے تمہاری حاجتیں اور ضرورتیں پوری ہوجائیں، یہ نہ ہو کہ فورڈ کمپنی، پیپسی کولا اور دوسری بڑی بڑی نیشنل اور انٹرنیشنل اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مالکان کی طرح ارب پتی ہونے کے باوجود روز بروز سرمایہ میں اضافہ اور ترقی ہی کا خواہش مند بنے رہو، کیوں کہ طلب میں اجمال نہ ہونے کے باعث ارباب دولت وثروت تو دن بدن اپنی دولت میں اضافہ کرتے رہیں گے، لیکن انسانی آبادی کی اکثریت افلاس واحتیاج سے دوچار ہوتی رہے گی۔

یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام کو ہماری بدحالی سے انسیت اور فاقہ مستی سے محبت نہیں، اسلام کے نزدیک خوشحالی اور دولت مندی کے حصول کے لئے کوشش کرنا قابل اعتراض نہیں ہے، لیکن اس کے لئے ذرائع جائز ہونے چاہئیں، ناجائز ذرائع اور حرام طریقوں سے کمائی ہوئی دولت کو اسلام ''مال غیر متقوم'' تسلیم کرتا ہے۔ آپ اپنی قابلیت اور صلاحیت کو کام میں لائیں اور خوب محنت کریں جس سے قوم اور ملت کو فائدہ پہنچے اور قوم اور ملک کی دولت میں ترقی اور اضافہ ہو، اس کے صلہ میں جتنی بھی دولت آپ کو حاصل ہو وہ باعث مسرت ہے، لیکن انسانی اور انسانی سماج کی کمزوری یہ ہے کہ جو خواب دیکھتا ہے محلوں، بڑی بڑی بلڈنگوں اور فیکٹریوں کے اور محنت اتنی بھی نہیں کرتا کہ پھونس کی ایک جھونپڑی تیار کر سکے۔ ہم کان سے جان چراتے ہیں اور خواہش یہ رکھتے ہیں کہ دولت ان کے گھر کی لونڈی ہو، ہم میں سے اکثر وبیشتر کی آمدنی کے جائز ذرائع جب ان کی خواہشات کو پورا نہیں کر سکتے تو پھر وہ ناجائز ذرائع سے بھی دریغ نہیں کرتے، وہ لوگوں کی جیبوں پر ہاتھ مارتے ہیں، شریف اور محنت کش شہریوں کے گھروں میں نقب لگا کر یا سرراہ اسلحہ کی نوک پر ان کی گاڑھے پسینے کی کمائی اڑا لیتے ہیں۔

معاشی نظام کے اہم ادارے:

اسلام کا معاشی نظام جن اداروں، تنظیمات اور ضوابط سے تشکیل پاتا ہے، ان میں نجی ملکیت کا ادارہ، نظام زکوۃ وعشر، خمس وخراج، قانون وراثت، خیرات وصدقات، شرکت ومضاربت، تجارتی لین دین کے ضابطے، سود اور قمار کی حرمت اور ریاست کی کفالت عامہ کی ذمہ داری وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ساتھ ہی یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ انسانی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، روزمرہ معاملات کی وہ صورتیں جن کا تصور ماضی کے انسان کے لئے ایک خواب تھا، اب وہ حقیقت بن کر سامنے آچکی ہیں اور یہ زمانے کی فطرت بھی ہے کہ وہ مختلف کروٹیں بدلتا رہتا

ہے،لیکن اسلام چونکہ قیامت تک رہنے کے لئے آیا ہے، اس لئے اس کی تعلیمات میں ایسی جامعیت موجود ہے کہ اس کے ذریعہ ہر دور کے مسائل کا حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔

چنانچہ جس طرح گذشتہ زمانے کے فقہاء کرام نے اپنے دور میں رونما ہونے والے معاملات کی جدید صورتوں کے شرعی احکام قرآن وحدیث سے مستنبط کر کے تفصیل سے بیان کئے، اسی طرح آج کے دور میں موجود علماء کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ موجودہ زمانے میں رائج معاملات کی حقیقت کو سمجھیں اور ان کا شرعی حل عوام کے سامنے پیش کریں، عصر حاضر میں جس طرح زندگی کے دیگر میدانوں میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں، اسی طرح تجارت اور باہمی لین دین کے طریقوں میں بھی بہت زیادہ پیچیدگیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ جیسے بیع الخیارات (Option Sale)، عقود المستقبلیات (Future Sale)، حاضر اور غائب سودے (Forward Sale) وغیرہ وہ معاملات ہیں جن کا ماضی میں عملی وجود تو درکنار، ان کا کوئی تصور تک نہیں تھا، لیکن یہ اب عملی حقیقت بن کر سامنے آچکے ہیں، یہی حال بینکاری میں رائج فنانس کے طریقوں (Mode of Finance) کا ہے، بینکاری کا یہ نظام قدیم فقہاء یا محدثین کے زمانہ میں بالکل نہ تھا بلکہ سولہویں صدی کے آخر میں اس کا آغاز ہوا اور آج یہ اپنی جدید سے جدید تر شکل میں موجود ہے۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ بینکنگ کا جدید نظام اب ہمارے معاشرے کا ایک لازمی حصہ ہے بلکہ یہ نظام موجودہ حالات میں کسی بھی ملک کی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی کا کردار ادا کرتا ہے، لیکن دوسری طرف اس میں رائج معاملات میں سے اکثر ناجائز اور حرام ہیں، کیوں کہ جن امور میں ہمارے لئے کوئی مصلحت یا نقصان ہے دین اسلام نے ہمیں ان سے متعلق اندھیرے میں نہیں رکھا، بلکہ وضاحت کے ساتھ ان میں ہماری رہنمائی کر دی ہے، اس لئے جب کوئی قوم اسلامی احکام پر عمل پیرا ہوگی تو اس کے جھگڑے اور اختلافات ختم ہو جائیں گے، ان احکامات میں سے مالی معاملات اور بینکاری نظام کے احکام بھی ہیں۔

روایتی بینکاری:

اگر ہم دور حاضر کے بینکوں کے معاملات کا جائزہ لیں گے تو ہمیں اچھی طرح معلوم ہوجائے گا کہ دور حاضر کے بینکوں کا سودی کاروبار ملک کے اقتصادی نظام کی یکسانیت کو درہم برہم کر دیتا ہے، کیونکہ مقروض کو اپنے کاروبار میں نقصان ہی کیوں نہ ہو، لیکن بینک کا روپیہ جو اس نے کاروبار کے لئے قرض دیا ہے، ہر صورت میں محفوظ رہتا ہے؛ کیونکہ یہ روپیہ مقروض کو ہر حالت میں بینک کو واپس کرنا پڑتا ہے، اور اس پر مقررہ شرح کے مطابق سود بھی ادا کرنا ہوتا ہے، منافع کی صورت میں بھی اکثر مقروض کو بمشکل ہی فائدہ پہنچتا ہے، کیونکہ بیشتر حالات میں منافع کی شرح سود کی شرح سے بھی کم ہوتی ہے، قرض چونکہ کسی جائیداد یا زیور یا کسی معتبر فرد کی گارنٹی یا ضمانت پر لیا جاتا ہے، اس لئے بینک کے پیسہ کے مرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا، البتہ مقروض بعض اوقات دیوالیہ بھی ہوجاتا ہے، اس کا کاروبار ٹھپ پڑ جاتا ہے، روزگار کی صورت حال بگڑتی ہے اور قیمتوں میں بھی اضافہ ہوتا ہے، صرف بڑے تاجر، کارخانہ دار اور سرمایہ دار ہی بینک سے قرض حاصل کر کے فائدہ اٹھا پاتے ہیں، کیونکہ وہ قرض کے روپئے سے نہ صرف اپنے کاروبار کو بڑھاتے ہیں، بلکہ ٹیکسوں سے بھی بچتے ہیں کہ وہ بینکوں کو قرض کی رقم کی مطابقت سے نہ تو ضمانت ہی مہیا کر سکتے ہیں اور نہ رہن کے لئے کوئی جائیداد ہی پیش کر سکتے ہیں، لہذا چھوٹے کاروباریوں کے سرمایہ کی مجبوری اور بڑے سرمایہ داروں اور ان تجارتی فرموں کی ترقی کے باعث ترقی، دولت کی تقسیم اور آمدنی کے توازن میں یکسانیت مفقود ہوجاتی ہے۔

اسلامی بینکنگ اور غیر سودی بینکنگ کا فرق:

مساوات کے تصور سے قطع نظر اسلام میں سود کو حرام قرار دیے جانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اس سے معاشرہ کی بدحالی دور ہو، غربت وافلاس کا خاتمہ ہو، قومی اور ملکی وقار میں اضافہ ہو، دولتمند اپنی دولت کو استعمال میں لا کر دولت کی مرکزیت کو ختم کریں اور عوام میں محنت

کرنے، کاروبار کرنے اور عزت کے ساتھ زندگی گزارنے کا جذبہ پیدا ہو، ان کا معیار زندگی بلند ہو، جس کے بعد ان میں تعلیمی رجحانات پیدا ہوں اور ان کے بچے بجائے محنت ومشقت کی زندگی گزارنے اور اپنے بچپن کو برباد کرنے کے مدارس میں جا کر علم کی روشنی حاصل کریں، جس سے ایجاد واختراج کی ہمت افزائی ہو؛ کیوں کہ یہی تمام ترقیاتی سرگرمیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے یہ کہنا اہمیت سے خالی نہیں کہ اسلامی بینکنگ محض سود سے پرہیز کا دوسرا نام نہیں ہے، سود کے نام کو ختم کر کے اسے اجارہ، اقتناء اور ٹھیکہ وغیرہ میں بدل دینا مشکل نہیں ہے، لیکن اس عمل سے اس کا نام اسلامی بینکنگ کے بجائے غیر سودی بینکنگ رکھنا زیادہ مناسب ہوگا، تاہم یہ نظام اسلام کے ارفع واعلی مقاصد کی بلندیوں کو نہیں چھوسکتا۔ اصل چیز ہے اسلامی بینکنگ کے ذریعہ معیشت میں وہ روح پھونکنا جو اعلی اسلامی اقدار کے قیام کے لئے معاشرہ میں اقتصادی اور ذہنی انقلاب برپا کر سکے، اور یہ انقلاب ہے عام غربت وافلاس اور بے روزگاری کو دور کرنا، دولت کا منصفانہ تقسیم ہونا، آمدنی کی مساویانہ تقسیم کے امکانات کو روشن کرنا، اور محنت ومشقت کے جذبہ کو بیدار کرنا۔

ڈاکٹر اوصاف صاحب لکھتے ہیں:

''مالی وسائل کے استعمال میں اسلامی بینک اپنے پیش رو سودی بینکوں سے زیادہ مختلف ہے، اور ایسا ہونے کے کئی قرین قیاس اسباب ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ سودی بینکوں میں مالی وسائل کے استعمال کا بس ایک واحد طریقہ ہے، اور وہ ہے سود پر قرض دینا، جس کو مختلف مالیاتی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے مختلف طریقے سے استعمال کیا جاتا ہے، جبکہ اسلامی بینک تحریم ربا کے باعث اس طریقے کو استعمال میں نہیں لاسکتے، چنانچہ اسلامی بینکوں کو مالیت رسانی (Financing) کے ایسے طریقوں کی تلاش ہوئی جن میں ربا کا شائبہ نہ ہو، جن کے ذریعہ سرمایہ کاری کی مختلف النوع ضروریات کی تسکین ہو سکے، اور وہ بینکوں کے لئے معقول اور محفوظ آمدنی کا ذریعہ بن سکیں (اسلامی بینکاری نظریاتی بنیادیں اور عملی تجربات/۴۵)۔

ذیل میں ہم ان طریقوں میں سے چند طریقوں کو بیان کریں گے جو اسلامی بینکوں میں مالی وسائل کے استعمال کے لئے وضع کئے گئے ہیں اور پھر ہم دیکھیں گے کہ ان طریقوں کے استعمال میں شریعت کے مقاصد کیا ہیں؟

مشارکہ:

''مشارکہ'' بھی ربا کے ان متبادلات میں سے ہے جو فقہاء نے اپنے اپنے زمانے میں تجویز کئے تھے، مشارکہ یا شرکت سے مراد وہ کاروبار ہے جو دو یا اس سے زیادہ افراد مل کر کریں۔

آج کل کی اصطلاح کی رو سے پارٹنرشپ، جوائنٹ اسٹاک کمپنی، اور کارپوریٹ فائنانسنگ کی ساری قسمیں، یہ سب دراصل مشارکہ ہی کی موجودہ مختلف شکلیں ہیں۔

ان ہی میں سے ایک قسم ''مشارکہ متناقصہ'' بھی ہے جس کو ''شرکت متناقصہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح سے ایک ''منتہیہ بالتملیک'' ہے، جو عام طور پر اسلامی بینکوں میں ایک پروڈکٹ کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ ان تمام شکلوں کے جائز ہونے میں کوئی شک نہیں، اگر یہ شریعت کی عمومی حدود کے اندر ہوں، اور ان میں کوئی ایسی چیز نہ ہو جو شریعت کے احکام سے براہ راست متعارض ہو، لہذا مشارکہ متناقصہ ہو یا اجارہ منتہیہ بالتملیک ہو یا اور بھی نئی شکلیں ہوں، اگر ان کے نتیجے میں شریعت کے مقاصد پورے ہو رہے ہوں، عامۃ الناس نفع ونقصان کے تحت کاروبار میں آزادانہ شریک ہو رہے ہوں اور شریعت کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ ہو رہی ہو تو پھر یہ سب جائز ہیں۔

جیسا کہ ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب نے اپنی کتاب ''معاش، اسلام اور مسلمان'' میں لکھتے ہیں:

''معاصر بازار مالیات میں بہت سے معاملات ایسے ہیں جو ناقص معلومات پر مبنی ہیں۔ مگر ان سے سہولت پیدا ہوتی ہے''۔ آگے لکھتے ہیں : ''کام صرف بنے بنائے ضابطے کی تطبیق کا نہیں، بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ متعلقہ مصالح کی ترویج اور ممکنہ مفاسد سے بچنے کی قابل عمل

شکل کیا ہوگی، اس کے ساتھ ہی بازار مالیات میں، رائج طریقوں کا مجموعی اثر سماج کے کلی مصالح، عدل، استقراء، ترقی، شخصی سطح پر سکون وطمانینت، معاشرتی سطح پر ربط وتماسک اور عالمی سطح پر امن میں کیا اور کہاں تک پڑتا ہے، کسی بھی طریق تمویل کے جائزے میں ان کلی امور کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، یہ کام مشکل ہے اور اس میں اختلاف کی گنجائش ہے'' (معاش: اسلام اور مسلمان/ ۸۴)۔

شرکت کے جواز کے دلائل:

جدید اقسام شرکت کے جواز کی دلیل شریعت کا وہ مشہور مقرر قاعدہ ہے :''**الأصل فی المعاملات الإباحة ما لم یدل علی التحریم**'' کہ معاملات میں اصل اباحت ہے جب تک کہ حرمت کی کوئی دلیل نہ پائی جائے۔ اس کے علاوہ خاص بات یہ ہے کہ جدید اقسام شرکت فقہی اعتبار سے کسی ایک یا اس سے زیادہ ایسی اقسام شرکت کے حکم میں ہیں جو شرعاً جائز ہیں، جیسے شرکت عنان اور مضاربہ وغیرہ۔

نیز عصر رسالت سے لے کر تمام ادوار میں لوگ شرکت کی بنیاد پر معاملات کرتے چلے آئے ہیں جو کہ اس کے جواز اور مشروعیت پر عملی اجماع ہے۔

یہ وہ اقسام شرکت ہیں جن کے احکام بیان کرنے کا فقہاء نے اہتمام کیا، اور یہی جدید اقسام شرکت کی بنیاد ہیں، جیسا کہ ''شرکت مساہمہ'' ہے، جس میں شریک کی ذاتی شخصیت کا اعتبار نہیں ہوتا، بلکہ شرکت میں اس کے حصص کا اعتبار ہوتا ہے، اس شرکت میں قانونی شخصیت کا اعتبار ہوتا ہے۔ فقہاء نے اقسام شرکت کے جو احکام وضوابط بیان کئے ہیں، وہ جدید اقسام شرکت پر پورے اترتے ہیں، جہاں تک شرکاء کی نمائندگی، ان کے حقوق کی حفاظت، معاملات چلانے اور حساب کتاب کو منظم کرنے کے لئے انتظامی اقدامات کا تعلق ہے، تو یہ سب مصلحت کے تقاضے ہیں، اگر یہ شرعی قواعد وضوابط پر پورے اترتے ہوں تو ان کی رعایت کی جانی چاہئے۔

شرکت کی اہم بنیاد ''وکالت'' ہے، شرکاء میں سے ہر شخص شرکت کی مصلحت کے لئے اپنی طرف سے اصیل اور دوسروں کی طرف سے وکیل ہوتا ہے، ''شرکت مفاوضہ'' میں وکالت کے ساتھ ساتھ کفالت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔

ثبوت شرکت کی عقلی دلیل:

اللہ تعالی نے تمام ادیان کے مقابلہ میں دین اسلام کو یہ خصوصیت عطا فرمائی ہے کہ اس میں انسان کی فطری ضروریات کو مدنظر رکھا گیا ہے، اور کوئی ایسا کام انسان کے ذمہ لازم نہیں کیا گیا جو اس کی قدرت ووسعت سے باہر ہو، چنانچہ ان ہی انسانی ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے شریعت مطہرہ نے شرکت کو جائز قرار دیا ہے، کیونکہ اگر شرکت کو جائز نہ کیا جاتا اور اس سے لوگوں کو منع کر دیا جاتا تو بنی نوع انسان کی تجارت کا ایک عظیم باب بند ہو جاتا، اور انسان کو نفع کے بجائے نقصان اور مشقت کا احتمال زیادہ تھا، شریعت چونکہ دنیا اور آخرت دونوں میں انسان کی بھلائی کی ضامن ہے، اس لئے اس نے انسان پر بے جا بندشیں لگا کر دین میں مشکلات پیدا نہیں کیں، البتہ اگر کوئی کام پوری انسانیت کے لئے باعث ضرر ونقصان نظر آیا تو اس پر پابندی لگا کر اسے حرام قرار دیدیا۔

قرآن کریم نے اسی بات کو ذکر فرمایا کہ:

''**وما جعل علیکم فی الدین من حرج**'' (سورۃ الحج: ۷۸) (اور اس نے تم پر دین کے احکام میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی)۔

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

''**یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر**'' (سورہ بقرہ: ۱۸۵) (اللہ تعالی تمہارے لئے آسانی چاہتے ہیں، مشکل نہیں چاہتے)۔

اور آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''**یسروا ولا تعسروا، بشروا ولا تنفروا**'' (بخاری: کتاب الجہاد والسیر ۳۰۳۸/،

مسلم: کتاب الجہاد والسیر ۱۷۳۲/۳) (لوگوں کے لئے آسانیاں پیدا کرو، مشکلات کھڑی نہ کرو، انھیں خوش خبری سناؤ، نفرت نہ دلاؤ)۔

احادیث مبارکہ سے شرکت کا ثبوت:

سنت رسول اللہ ﷺ میں قول اور تقریر دونوں سے شرکت کا جواز ثابت ہوتا ہے۔

۱۔حضور پاک ﷺ سے ایک حدیث قدسی منقول ہے:

"عن أبی هريرة قال:قال رسول الله ﷺ:يقول الله تعالى:أنا ثالث الشريكين مالم يخن أحدهما" (دیکھئے: رواہ ابوداؤد، ج۵، رقم الحدیث: ۳۲۴۳، ۲۹۳۶، وصححہ الحاکم فی مستدرکہ، ورواہ الدارقطنی، الشرکات ۱:۱۶۰)۔

(حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں: میں دو شریکوں کے درمیان تیسرا شریک ہوں، جب تک ان میں کوئی ایک خیانت نہ کرے)۔

اور دارقطنی کی ایک روایت میں ہے: **"فإذا خان أحدهما صاحبه رفعها عنهما"** (دارقطنی: کتاب البیوع ۱۳۴۱/۳) (پس جب ان دونوں میں سے ایک اپنے ساتھی سے خیانت کرے، تو اس کو ان دونوں سے اٹھا دیتے ہیں (یعنی خیانت کی وجہ سے برکت ختم ہوجاتی ہے)۔

اس حدیث سے شرکت کا نہ صرف جواز معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کی ترغیب معلوم ہوتی ہے کہ جب تک شرکاء کے مابین خیانت نہ ہو، اللہ تعالی ان کے ساتھ رہتے ہیں، اور اپنی برکت وحفاظت نازل فرماتے ہیں (دیکھئے: ابن قدامہ المقدسی ابومحمد عبد اللہ بن احمد بن محمد: المغنی مکتبۃ الریاض السعودیہ ۱۴۰۳، ۵:۱۰۵)۔

۲۔ **"أخرج أبويعلى والبيهقى عن النعمان بن بشير رضی اللہ عنہ قال:قال رسول الله ﷺ :من خان شريكا فيما ائتمنه عليه واسترعاه له فإنه برئ منه"** (ضعیف الترغیب والترہیب ۱۱۱۷/۴) (جس شخص نے اپنے شریک کی اس مال میں خیانت کی جس میں اس کو

امانت اور حفاظت سپرد کی گئی تھی، تو حضور ﷺ اس شخص سے بری ہیں)، اس روایت سے بھی شرکت کا ثبوت ہوتا ہے، بلکہ اس میں شرکت میں خیانت کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

۳۔ "عن النبی ﷺ: **يد الله مع الشريكين مالم يتخاونا، فإذا تخاونا محقت تجارتهما فرفعت البركة منها**" (دار قطنی: کتاب البیوع ۳/۱۳۴۱ باختلاف یسیر)

(حضور ﷺ سے مروی ہے کہ اللہ تعالی کا ہاتھ شریکین (دو شریکوں) کے ساتھ رہتا ہے جب تک خیانت نہ کریں، پس اگر وہ خیانت کریں گے تو ان کی تجارت مٹا دی جائے گی، اور اس میں برکت ختم ہو جائے گی)۔

مشارکہ متناقصہ:

شراکت داری کی ایک نئی قسم ہے جس کا ذکر کتب فقہ میں نہیں ملتا، اور سب سے پہلے اس کا استعمال اسلامی بینک میں ہی کیا گیا ہے۔ متناقصہ نقص سے ماخوذ ہے، جس کا مطلب ہے کمی۔ مشارکہ متناقصہ سے مراد ایسا مشارکہ ہے جس میں ایک شریک دوسرے شریک کا حصہ تدریجاً خریدنے کا وعدہ کرتا ہے، حتی کہ آخر میں وہ شریک پورے اثاثہ کا مالک بن جاتا ہے، اسلامی بینکوں میں مشارکہ متناقصہ کا استعمال عموماً ٹھوس اثاثہ جات کی تمویل (Fixed Asset Financing) میں کیا جاتا ہے، اور کبھی کسی کاروبار میں مشارکہ متناقصہ کے ذریعہ مالی تمویل کاری کی ضروریات کو بھی پورا کیا جاتا ہے، شرعیہ اسٹینڈرز کے مطابق مشارکہ متناقصہ کا شمار شرکۃ العقد کی قسم شرکۃ العنان میں سے ہے، جبکہ مروجہ اسلامی بینکوں کے تعامل سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اسے شرکۃ الملک کی حیثیت دیتے ہیں۔

جس کی عملی صورت یہ ہے کہ بینک کسی پروجیکٹ میں ایک مالی شریک (Financer) کی حیثیت سے اس میں شریک ہوتا ہے، اور اس پروجیکٹ سے ہونے والی متوقع آمدنی کا پیش قیاسی (Forcasting) کے ذریعہ تعین کرلیا جاتا ہے۔ پھر بینک اور شریک کے درمیان ایک معاہدہ قرار پاتا ہے، جس کی رو سے بینک ایک شریک کی حیثیت میں منافع کا

حصہ دار بنتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی معاہدہ کی ایک دوسری شق کی رو سے پروجیکٹ کی خالص آمدنی (Net income) کا ایک حصہ بینک کو اس کے راس المال کی ادائیگی کے لئے دیا جاتا ہے۔ بقیہ آمدنی دوسرا شریک رکھتا ہے۔ اس طرح پروجیکٹ میں بینک کی حصہ داری رفتہ رفتہ کم ہوجاتی ہے، اور دوسرے فریق کا حصہ بڑھتا رہتا ہے۔ بالآخر فریق ثانی اس پروجیکٹ کا مکمل طور پر مالک بن جاتا ہے، اور اسے بینک کو کسی قسم کی کوئی ادائیگی نہیں کرنی ہوگی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کا باہمی اشتراک عمل نہ صرف موجب ثواب ہے، بلکہ ایک دوسرے کی تقویت اور برکت کا باعث ہے؛ کیونکہ شرکت کی ضرورت تجارت میں اس لئے بھی زیادہ ہے کہ بعض اوقات انسان کے پاس مال واسباب تو وافر مقدار میں مہیا ہوتا ہے، البتہ وہ اس صلاحیت اور مہارت سے محروم ہوتا ہے جو کاروبار کے لئے درکار ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ اپنا سرمایہ کسی دوسرے کے حوالہ کردیتا ہے، اور اس سے شرکت یا مضاربت کا معاملہ طے کرلیتا ہے، خاص طور پر آج کل کے دور میں جو صنعتی دور ہے، ملیں، کارخانے اور بڑی بڑی صنعتیں لگانے کی حاجت ہوتی ہے، جس کے لئے اتنی خطیر رقم کی ضرورت ہوتی ہے کہ عام طور پر ایک یا دو افراد مہیا نہیں کرسکتے، لہذا کچھ افراد کے لئے مشترکہ طور پر فنڈ اکٹھا کرکے کاروبار کرنا ناگزیر ہے، اس کے بغیر وہ کاروبار نہیں چل سکتا، لہذا اس دور میں تو شرکت کے بغیر تجارتی ضروریات پوری ہو ہی نہیں سکتی۔

مزید برآں اللہ تعالی نے ہر انسان کو مختلف صلاحیتوں سے نوازا ہے، کوئی کسی ہنر میں طاق اور ماہر ہوتا ہے، تو دوسرا کسی اور فن میں مہارت رکھتا ہے، چنانچہ اگر کچھ افراد مل کر کام کریں تو یہ ممکن ہے کہ ایک شخص انتظامات (Management) میں ماہر ہو، اور دوسرا تجارت میں، اور تیسرا تعلقات اور ساکھ میں فوقیت رکھتا ہو، اس طرح مشترک طور پر کام کرنے سے تین افراد کی قوتیں مجتمع ہوں گی تو اس کے فوائد بھی زیادہ ہوں گے نیز اس سے اجتماعی مصالح کی تکمیل بھی ہوگی۔

مضاربہ:

مضاربہ کی مشروعیت کے دلائل:

الف: قرآن کریم میں اللہ تعالی فرماتا ہے :"وآخرون یضربون فی الأرض یبتغون من فضل اللہ" (المزمل: ۲۰) (اور بعض دوسرے لوگ زمین میں سفر کرتے ہیں؛ تا کہ اللہ کا فضل تلاش کریں)۔

"یضربون فی الأرض" سے مراد وہ لوگ ہیں جو تجارتی اغراض سے زمین میں سفر کرتے ہیں؛ تا کہ اپنے اہل وعیال کے نفقہ کے لئے مال حلال کما سکیں۔

احادیث میں مشروعیت کے دلائل: حدیث شریف میں ہے کہ حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ جب مال کسی کو بطور مضاربت دیتے تو یہ شرط لگاتے کہ وہ اس کے ساتھ سمندر میں سفر نہیں کرے گا، اور نہ ہی وادی میں اترے گا، اور نہ ہی اس سے زندہ جانور خریدے گا، اگر ایسا کیا تو وہ ضامن ہوگا، جب حضرت عباسؓ کی لگائی ہوئی شرط آپ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے اس کی اجازت دی (بیہقی : کتاب الدیون والمضاربہ ۷/۱۲۱۸)۔

آثار میں روایت کیا جاتا ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک شخص کو یتیم کا مال بطور مضاربہ دیا جو عراق میں اس سے کاروبار کیا کرتا تھا (سنن الکبری للبیہقی: کتاب الدیون والمضاربہ ۷/۱۲۱۵)۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حکیم بن حزامؓ سے روایت ہے کہ ان دونوں نے مضاربہ پر کاروبار کیا (بیہقی: کتاب الدیون والمضاربہ)، صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے بھی ان دونوں کی خلاف ورزی نہیں کی، لہذا مضاربہ کی مشروعیت پر اجماع ہوگا۔

ج: ابن منذرؒ نے مضاربہ کے جواز پر اہل علم کا اجماع ذکر کیا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک روپیہ پیسہ کو کام میں نہ لگایا جائے تب تک وہ نہیں بڑھتا، اور نہ ہی اس شرط پر کسی شخص کو روپیہ پیسہ کرائے پر دینا جائز ہے کہ وہ بڑھا کر اسے واپس کرے؛ کیونکہ یہ سودی قرضہ بن جاتا ہے۔

مضاربت کے مشروعیت کے مقاصد:

ایک طرف مالدار جو اپنے مال کی خود سرمایہ کاری میں دلچسپی نہیں رکھتے، دوسری طرف تجربہ کار کاروباری حضرات جو ناکافی سرمایہ کی وجہ سے کاروبار نہیں کر سکتے، ان دونوں کے درمیان سرمایہ کارانہ تعاون بڑھانے کے لئے مضاربہ مشروع ہوا، کچھ لوگ مال وزر کے مالک ہونے کے باوجود تجارتی معاملات سے بالکل ناواقف ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ سرمایہ کاری میں تجربہ رکھنے کے باوجود بالکل خالی ہوتے ہیں، تو ان دونوں قسم کے لوگوں کی مصلحتوں کو پورا کرنے کے لئے اس قسم کے عقود کو جائز کیا گیا۔ مضاربہ کا لفظ ان صیغوں میں شمار ہوتا ہے جو اکثر تجارت میں استعمال ہوتے ہیں، پھر اس لفظ میں وسعت ہوئی یہاں تک کہ تجارتی، زرعی، صنعتی اور خدمات جیسے شعبوں کی سرمایہ کاری کو بھی شامل ہو گیا۔

پس ''مضاربت'' کا شمار مقاصد شریعت کی دوسری بنیاد ''حاجیات'' میں ہے، یعنی شریعت نے انسان کی حاجتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مضاربت کو جائز قرار دیا ہے، کیوں کہ انسانوں میں کچھ لوگ مال دار تو ہوتے ہیں، مگر وہ فرصت، صحت، یا ہنر نہیں رکھتے کہ وہ اپنے مال کی حفاظت کر سکیں یا اس میں اضافہ کر کے اپنی ضروریات پوری کر سکیں، اسی طرح بعض لوگ فرصت، صحت اور ہنر تو رکھتے ہیں، مگر ان کے پاس مال نہیں ہوتا، جس کے ذریعہ وہ اپنے ہنر کے جوہر دکھا کر اپنے لئے کچھ روزی مہیا کر سکیں، غرض مال دار کسی ہنر مند شخص کا حاجت مند ہوتا ہے اور ہنر مند شخص کسی مال دار کے مال کا محتاج ہوتا ہے، اب اگر شریعت ان دونوں طبقوں کی ''حاجتوں'' کا لحاظ نہ کرتی تو دونوں حرج اور مشقت میں مبتلا ہو جاتے، اس لئے شریعت نے معاملۂ مضاربت کو جائز قرار دیا تا کہ مالدار اپنا مال کسی ہنر مند کے حوالہ کر دے اور ہنر مند اپنے ہنر اور محنت و تجارت کے ذریعہ اس میں اضافہ کرے اور جو نفع حاصل ہو اس میں دونوں شریک ہوں اور دونوں اپنی اپنی حاجتیں پوری کر سکیں۔

عصر حاضر میں بینکوں اور مالیاتی اداروں کی اہمیت کافی بڑھ گئی ہے اور ان کا ہر خاص

وعام ضرورت مند ہو گیا ہے، جیسے جیسے زمانہ ترقی کر رہا ہے، لوگوں کا معیار زندگی اونچا ہوتا جا رہا ہے، آسائشات، سہولیات، سہل پسندی کے علاوہ ضروریات وحاجات میں اضافہ ہوا ہے۔ زمانہ ایک جانب اونچے معیار کا حامل ہوتا جا رہا ہے تو دوسری جانب مال کی حفاظت، مالی استحکام کے نت نئے ذرائع کی جستجو اور مالی پوزیشن میں ترقی کی جدوجہد بھی انسانی معاشرہ میں دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ معاشرہ کی اسی معاشی جدوجہد نے مالی اداروں اور بینکوں کو تجارتی لائن پر ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے لئے مستعد کر دیا۔ روزانہ نت نئی اسکیمیں بینکوں سے جاری ہوتی رہتی ہیں، نئے نئے پلان، آمدنی بڑھانے کے ذرائع، مالی استحکام کے لئے مشورے، بینکوں اور مالی اداروں سے دیئے جا رہے ہیں۔

اس زمانہ میں انسان کی زندگی کا جہاں معیار اونچا ہوا ہے، وہیں حالات نے اس کو مال اور مالی اداروں کا محتاج بنا دیا، جس کے نتیجے میں مالی ادارے محفوظ طریقے سے قرض اور ضروریات کی تکمیل کا انتظام کرنے لگے ہیں، اس سے ایک طرف ان کا کاروبار چلنے لگا اور دوسری طرف ان کے منافع میں اضافہ ہی اضافہ ہونے لگا۔ اسی جدید دور کی پیداوار قرض کی ایک نئی شکل اسلامی بینکنگ میں ''تورق'' اور ''عینہ'' ہے۔

تورق:

دراصل قرض انسانی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے، جس سے اس کو کبھی بے نیازی نہیں ہوسکتی، کتاب اللہ میں اس کا ذکر بڑے اہتمام کے ساتھ آیا ہے اور مسلمان معاشرے کو اس کے لئے غیر معمولی طور پر ترغیب دی گئی ہے، احادیث میں بھی قرض دینے کی اسی طرح فضیلت بیان کی گئی ہے اور قرض لینے والے اور دینے والے دونوں کے لئے اس کے آداب کی تفصیل کی گئی ہے، لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو ضرورت کے وقت سادہ قرض نہیں مل پاتا، اس صورت میں خسارہ کے ساتھ یعنی کہ اس پر کچھ اضافی رقم ادا کر کے بھی اس کو اپنے موقع پر قرض مل جائے تو اس کے لئے ہر طرح سے سہولت کا باعث ہے، اسلامی فلاحی

ریاست میں ہر چند کہ بہت کچھ یہ ذمہ داری حکومت کی بھی ہے کہ وہ ضرورت مند کے لئے وقت پر قرض کی فراہمی کا نظم کرے، لیکن یہ آئیڈیل ہے اور صرف آئیڈیل کے سہارے سماج کی گاڑی آگے نہیں بڑھ سکتی، اس لئے موجودہ بینکوں میں ''تورق'' کی صورت میں کچھ اضافی رقم کی ادائیگی سے قرض کی جس صورت کا رواج ہے اس کو جاری رہنا چاہئے، انسانی زندگی کی گاڑی اصلاً نقد رقم سے چلتی ہے، اس لئے اکثر اوقات اگر آدمی کے پاس اس کی کمی ہوجائے تو اس کو شدید ضرر لاحق ہوسکتا ہے، جس سے بچنا اور بچانا شریعت کے بنیادی مقاصد میں سے ہے، اس لئے معاصر بینکوں میں ''تورق'' کی جتنی صورتیں رائج ہیں جس کے ذریعہ آدمی کو ضرورت کے وقت نقد رقم بطور قرض فراہم ہوجاتی ہے، اس کو جاری رہنا چاہئے، البتہ متعلق افراد کو کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اس سہولت کے دائرے کو غیر ضروری طور پر دراز نہ کرے اور ''تورق'' سے اسی حد تک فائدہ اٹھائیں جتنا کہ ناگزیر ہو، اس لئے کہ قرض پر اضافی رقم کی ادائیگی ضرورت کی صورت میں ہی جواز کے دائرے میں آتی ہے، اور ضرورت کا اصول معلوم ہے کہ اسے ناگزیر دائرے سے آگے نہیں بڑھنا چاہئے۔ ''والضرورة تقدر بقدرها''، اسی لئے ہمارے فقہاء کرام نے بھی یہ صراحت فرمائی ہے کہ کہیں کہیں اکا دکا مواقع پر کسی قانونی تنگی کو دور کرنے کے لئے شرعی حیلہ اختیار کرنے کی تو گنجائش ہے لیکن ایسی حیلہ سازی جس سے مقاصد شریعت فوت ہوجائے اس کی قطعاً اجازت نہیں ہے، اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ چند حیلوں کے ذریعہ ہم موجودہ طریق کار کو ذرا سا تبدیل کرکے سارا نظام جوں کا توں برقرار رکھیں اور اسلامی نام سے موسوم کرکے لوگوں کو خواہ مخواہ مغالطہ میں ڈال دیں۔

اگر ہم تورق کی بات کریں تو تورق اسلامی بینکوں میں فائنانسنگ کا ایک نیا طریقہ ہے، جس کے ذریعہ طلب گاروں کو نقد فراہم کیا جاتا ہے، یعنی ایسے کسٹمرز جن کو نقد کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بینک سے مال ادھار خریدتے ہیں، پھر وہ اس مال کو ایک فریق ثالث کے ہاتھوں اپنی قیمت خرید سے کم دام پر فروخت کرکے نقد حاصل کرلیتے ہیں، اور اخیر میں جب

گاہک کو نقد مل جاتا ہے تو پھر اسے اس کے عوض اس ادھار کی طے شدہ مدت ختم ہونے پر اس سے زیادہ رقم واپس کرنا پڑتا ہے۔ اسی طرح بینک کھاتہ دار سے کوئی چیز ادھار خریدتا ہے اور اس چیز کو فریق ثالث کے ہاتھوں اپنی قیمت خرید سے کم دام پر فروخت کر کے نقد حاصل کر لیتا ہے۔ اس سے ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے مطابق ایک نیا قرض جنم لیتا ہے؛ کیوں کہ تورق کے پیدا کردہ قرض کی مقدار ہمیشہ اس نقد کی مقدار سے زیادہ ہوتی ہے، جو متورق کو ملتا ہے؛ کیوں کہ اوپر ذکر کردہ دونوں مثالوں میں بینک کو جو نقد ہاتھ آیا وہ لازماً اور دائماً اس قرضے سے کم ہوگا جس کی لازمی ادائیگی مقررہ مدت کے بعد کرنا ہے، جس کا نتیجہ ڈاکٹر صاحب کے بقول ''خلاف عدل بھی ہے؛ کیوں کہ جس ماحول میں پیداواری عمل انجام پاتا ہے، وہ انسان کو اس کی گارنٹی نہیں دیتا کہ جو دولت پیداواری عمل میں لگائی جائے گی وہ لازماً اور دائماً اپنی مقدار سے بڑھی ہوئی مقدار میں دولت پیدا کرے گی، اور جب ایسا ہے تو پیداواری سرمایہ فراہم کرنے والے کو اس کے سرمایہ کی اضافہ کے ساتھ واپسی کی گارنٹی کا کوئی جواز نہیں ہے'' (مقاصد شریعت ۲۴۱/)۔

آگے لکھتے ہیں: ''معیشت میں بڑھتی مقدار کے ساتھ جوئے بازی (Speculation) اور اس کے نتیجے میں عدم استقرار اور تقسیم دولت و آمدنی کی ناہمواری میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، یہ سب اسلام کے منشا و مقصد کے خلاف ہے'' (حوالہ سابق ۲۵۱/)۔

آگے لکھتے ہیں: ''جن شریعہ محققین نے اس کو بڑھاوا دیا ہے انہوں نے خرید و فروخت کے متعلقہ معاہدوں پر نظر ڈالی، مگر معیشت میں کلی طور پر اس کے اثرات کو نہیں سامنے رکھ سکے، جب کہ اس جیسے معاملے کو مصالح اور مفاسد کی میزان میں پرکھنا لازمی تھا'' (حوالہ سابق)۔

ڈاکٹر صاحب اس طرح کے غیر شرعی فائنانسنگ کے طریقوں سے بچنے کی تدابیر بھی بتاتے ہیں، لکھتے ہیں:

''مذکورہ بالا دباؤ، تناؤ اور بیش از بیش نمو کی طرف اسلامی بینکوں کے لامتناہی دوڑ سے

صرف وہ نظام مالیات بچا سکتا ہے جس میں سرمایہ سپلائی کرنے والوں اور اس کو کارآمد بنا کر اس کے ذریعہ دولت میں اضافہ کرنے والوں کا نفع ساتھ ساتھ شروع ہو، جیسا کہ مشارکت اور مضاربت یا ان پر مبنی طریقوں میں ہوتا ہے'' (حوالہ سابق/ ۲۵۲)۔

اس پس منظر میں غور وخوض اور بحث ومباحثہ کے بعد فقہ اکیڈمی انڈیا کے سمینار میں درج ذیل قرار دادیں طے پائیں:

۱۔ اگر اسلامی بینک یا کوئی اور مالیاتی ادارہ قرض لینے والے کے ہاتھ سامان زیادہ قیمت میں ادھار فروخت کر کے کم قیمت میں خود ہی یا اس کا کوئی ذیلی ادارہ خریدتا ہے، تو یہ ناجائز ہے۔

۲۔ اگر بینک حقیقت میں خرید وفروخت نہیں کرتا، بلکہ یہ صرف کاغذی کاروائی ہوتی ہے تو بھی یہ شرعاً ناجائز ہے۔

۳۔ اگر اسلامی بینک قرض لینے والے کے ہاتھ اپنا کوئی سامان زائد قیمت میں ادھار فروخت کر کے بے تعلق ہو جائے اور خریدار اس سامان کو قبضہ میں لینے کے بعد اپنے طور پر کسی ایسے شخص کے ہاتھ کم قیمت میں نقد فروخت کر دے، جس کا اس بینک سے اس معاملہ میں کوئی تجارتی تعلق نہ ہو، تو یہ صورت جائز ودرست ہوگی۔

بیع عینہ:

بینکوں میں رائج عینہ پر ایک نظر:

جہاں تک بیع عینہ کا تعلق ہے، تو وہ قرض ہی کی ایک صورت ہے، قرض لینا ایک انسانی ضرورت ہے، اور قرض کے طالب کی ضرورت پوری کرنا ایک اخلاقی فریضہ اور باہمی اخوت کی علامت ہے، اور یہ قرض لینے والے کی خالص امداد ہے، جس پر کوئی نفع لینا درست نہیں، شریعت اسلامیہ نے اس سے منع کیا ہے، اور اسے ربا اور سود قرار دیا ہے، جس کے بارے میں کتاب وسنت میں سخت وعیدیں وارد ہیں، اور کسی قرض پر اضافی رقم حاصل کرنے

کے لئے کوئی حیلہ اختیار کرنا بھی درست نہیں ہونا چاہئے، اس لئے کہ اس میں ربا کا شبہ ہوسکتا ہے، چنانچہ بیع عینہ کو اسی لئے اکثر فقہاء نے حرام قرار دیا ہے، اس کی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو سامان ادھار فروخت کرے اور کسی کی قیمت حاصل کرنے سے پہلے اسی سامان کو نقد اس سے کم دام میں خرید لے، بیع کی اس صورت کو امام شافعیؒ نے جائز قرار دیا ہے؛ کیونکہ جب اس نے خرید لیا تو اس کو جس طرح یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ جسے چاہے فروخت کرے ویسے ہی بائع کے ہاتھ بھی فروخت کرسکتا ہے۔

امام شافعیؒ کی جانب اس کے جواز کی نسبت صحیح مسلم کی شرح میں نوویؒ نے بھی کیا ہے، اور صاحب ہدایہ (۴۱/۳) نے بھی کیا ہے۔

دیگر ائمہ کرام کے نزدیک یہ بیع ناجائز اور حرام ہے، اور اس کی حرمت پر استدلال متعدد طرق سے کیا گیا ہے، مثلاً :

۱۔ یہ ربا یعنی سود کا وسیلہ ہے، اور چونکہ ربا حرام ہے اس لئے اس کا وسیلہ بھی حرام ہوگا؛ کیونکہ ادھار بیچنے والے نے زیادہ قیمت میں فروخت کیا، اور اس کے ثمن پر قبضہ کرنے سے پہلے اس سے کم قیمت میں خرید لیا، اس طرح گویا اس سے متعینہ روپیے کے بدلہ میں روپیے حاصل کئے، چنانچہ حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ ان سے ایسے آدمی کے متعلق پوچھا گیا جس نے ایک کپڑا سو میں بیچا اور پچاس میں خرید لیا تو انہوں نے جواب دیا کہ "**دراهم بدراهم متفاضلة دخلت بينهما حريرة**" (تہذیب سنن ابی داؤد لابن القیم ۱۰۱/۵) (دراہم کے بدلہ میں درہم تفاضل کے ساتھ اور ان کے درمیان کپڑا حیلہ ہے) یعنی اس طریقے سے بچو کہ آپ درہم کے بدلہ درہم بیچو کہ ان کے درمیان کپڑا ایک حیلہ ہے۔

۲۔ بیع عینہ، بیع فی بیعتین اور ربح مالم یضمن پر مشتمل ہے، جس سے حدیث میں منع کیا گیا ہے، ابن قیمؒ نے بیع فی بیعتین کی ایک تفسیر یہ نقل کی ہے کہ بائع یہ کہے کہ میں یہ سامان تم کو سو روپیے میں سال بھر کے ادھار پر فروخت کررہا ہوں، اس طور پر کہ تم سے میں نقد (۸۰/روپیے) میں لے لوں گا، اور یہ کہا ہے کہ یہی تفسیر حدیث میں مذکور "**فله أو كسهما أو**

الربا'' (ابوداؤد: کتاب الاجارہ/۳۴۶۱) کے زیادہ مطابق ہے، اس لئے کہ یا تو وہ زائد ثمن (سو روپیے) کو لے گا، تو وہ ربا ہوگا، یا نقد ثمن کو لے گا تو وہ اوکس (کم والی رقم) پانے کا مصداق ہوگا، حدیث کے الفاظ ہیں:

''**من باع بیعتین فی بیعة فله أو کسهما أو الربا**'' (سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فیمن باع بیعتین فی بیعة، حدیث نمبر:۳۳۱۶)۔

۳۔ بیع عینہ بیع مضطر پر بھی مشتمل ہے، کیونکہ جس شخص کو نقد کی ضرورت ہے وہ قرض کے لئے گیا ہے، وہ بائع سے اس سامان کے خریدنے پر بھی مضطر ہے اور پھر اسے اس کے ہاتھ فروخت کرنے پر بھی مجبور و مضطر ہے۔

خلاصہ یہ کہ بیع العینہ دراصل حرمت کی وہ قسم ہے جسے سود کا راستہ روکنے کے لئے حرام قرار دیا گیا ہے، بیع العینہ ربا کا ایک حیلہ تھا، اس کی شکل یہ ہوتی تھی کہ چند ایک ہزار روپے میں ادھار خرید کر پھر اسی بائع کے ہاتھ نو سو روپے نقد میں فروخت کردی جائے، مثال کے طور پر کسی نے کسی سے ایک گاڑی پانچ لاکھ روپے میں ادھار خریدی اور پھر اسی بائع (بیچنے والے) کے ہاتھ چار لاکھ روپے میں نقد فروخت کردی، تو گویا اس شخص کو عملاً چار لاکھ روپے ملے، لیکن جو رقم اس کے ذمہ واجب الادا قرار پائی، وہ پانچ لاکھ ہے۔ گویا چار لاکھ روپے لے کر اس نے پانچ لاکھ روپے ادا کئے، گاڑی درمیان میں محض بطور حیلے کے استعمال ہوئی، اسی کا نام سود ہے، یہی بیع العینہ کہلاتا ہے، گویا اصل مقصد چار لاکھ لے کر پانچ لاکھ واپس کرنا ہے، اس لئے یہ ایک سراسر سودی حیلہ ہے جس کی احادیث میں واضح طور پر ممانعت آئی ہے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شریعت نے اس طرح کے معاملات کو جو حرام قرار دیا ہے، وہ کیوں حرام قرار دیا ہے؟ ان کے حرام کئے جانے کی کیا مصلحت وحکمت ہے۔

اصل میں اسلامی شریعت نے جہاں جن جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، ان کے متبادل صورتوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ اس حرام کا ارتکاب کرنے کے اگر کوئی ممکنہ راستے ہوسکتے تھے، تو ان راستوں کی بھی احادیث میں نشاندہی کی گئی ہے اور ایسے تمام راستوں اور

سوراخوں کو ایک ایک کر کے شریعت نے بند کر دیا ہے، اس لئے احادیث کا بنیادی سبق یہی ہے کہ آج بھی ان سے استفادہ کرتے ہوئے ان تمام راستوں کی نشاندہی کی جائے، جو ربا اور قمار تک پہنچا دیتی ہے۔

اسی کی ایک مثال بیع مزابنہ بھی ہے، جس کی ممانعت حدیث میں وارد ہوئی ہے، جس میں ہوتا یہ تھا کہ ایک شخص اپنے کھجور، گندم یا کوئی زرعی پیداوار جو اس کے پاس تولی ہوئی مقررہ وزن کے ساتھ موجود ہوتی تھی، وہ دوسرے کسی شخص کے درخت پر لگی ہوئی چیز کو اس تولی ہوئی چیز کے مقابلے میں فروخت کرتا تھا، اور جو درخت پر لگی ہوتی تھی اس کی کمیت اور مالیت کا محض اندازہ کر لیا جاتا تھا، اسی کو مزابنہ کہتے ہیں، یہ جائز نہیں ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہوسکتا ہے جو کھجور درخت پر سے اترے وہ اتنا نہ ہو جتنے میں اس نے بیچا ہے، بلکہ اس سے کم ہو یا ہو ہی نہ، یا برباد اور خراب ہو جائے۔ دونوں صورتوں میں یہاں اس کا قوی امکان ہے کہ یہ کاروبار ربا اور غرر کا شکار ہو جائے، ہاتھ در ہاتھ اور برابر سرابر بھی نہ ہو، دونوں صورتوں میں یہ ربا الفضل ہو جائے گا، لہذا شریعت نے اس کو ممنوع قرار دیا کہ اس سے سود کا دروازہ کھل جائے گا۔

اسی نوعیت کی ایک مثال ''بیع الکالئ بالکالئ'' بھی ہے، یعنی دین کی خرید و فروخت دین کے ساتھ، اس سے بھی چونکہ ربا کا راستہ کھلتا ہے، اس لئے شریعت نے اس کو بھی حرام قرار دے دیا۔

مرابحہ:

اگر ہم مرابحہ کی بات کریں تو موجودہ دور میں بینک کاری کا جو عمومی ضابطہ پایا جاتا ہے، وہ یہ کہ بینک کوئی چیز خرید کر گاہک مشتری کو دیتا ہے اور پھر اس کا متعین سود قسط وار وصول کرتا ہے، یا بینک کی ہدایت پر خریدار کوئی چیز خرید لیتا ہے اور اس کا بل بینک ادا کر کے متعین شرح سود کے ساتھ اسے مقررہ مدت میں وصول کرتا ہے، اب اگر کوئی اسلامی بینک اسلامی اصولوں کے تحت مرابحہ کرنا چاہتا ہو تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صارفین کا بل ادا کر کے سود وصول

کرنے کے بجائے مطلوبہ اشیاء خود خرید کر مرابحہ کے اصولوں کے مطابق اس میں اپنا کمیشن شامل کر کے صارفین کو دے۔ اس طرح کمیشن کے نام سے شاید کچھ زیادہ وصول کرنے کی بھی گنجائش نکل سکتی ہے۔ جس کی وجہ سے ادھار دینے میں سال دو سال کے بعد مالیت (Value) کی کمی کا خطرہ بھی کسی حد تک ٹل سکتا ہے۔ مگر ہاں! ایک مرتبہ کسی چیز کی قیمت مقرر کر دینے کے بعد کسی وجہ سے عدم ادائیگی کے باعث پھر دوبارہ قیمت بڑھانا یا راس المال میں اضافہ کرنا سود بن جائے گا۔

دوسری بات یہ کہ کمیشن یا پرافٹ (منافع) کی شرح بھی اتنی زیادہ نہ بڑھادی جائے کہ اس کے نتیجے میں اشیاء کی مجموعی قیمت بہت زیادہ ہوجائے جس سے عام طور پر غیر اسلامی بینک سود کے نام پر وصول کرتے ہیں، البتہ اسلامی بینکوں کے لئے اسلامی بینکاری کے نام سے یہ عمل جائز نہیں ہوگا اگرچہ شرعی اعتبار سے اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

لیکن مقاصد شریعت کے پہلو سے دیکھا جائے تو ایسا کرنے میں عوام میں اسلامی بینکاری کا تصور بگڑ جائے گا اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوجائیں گے کہ مجموعی اعتبار سے سودی اور غیر سودی کاروبار میں کوئی فرق نہیں ہے۔

جیسا کہ ڈاکٹر اوصاف صاحب لکھتے ہیں :

''تاہم بینکوں کے ان تمام طریقوں میں سے ''دوبارہ خریداری'' اور ''بیع مؤجل'' کے استعمال میں نہایت احتیاط سے کام لینا چاہئے؛ کیونکہ ذرا سی غلطی سے یہ ربا کے حدود میں داخل ہوجائے گا، لہذا احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ ان اقسام سے تعلق رکھنے والے معاہدوں کی منظوری بینکوں سے متعلق شریعہ بورڈ سے لے لی جائے، اس کے بعد ہی اس پر عمل کیا جائے'' (اسلامی معاشیات اور بینک کاری/۱۰۵)۔

تعارف (Introduction) :

مرابحہ دراصل بیع (Sale) کی ایک قسم ہے جس میں فروخت کنندہ (Seller) اپنی چیز دوسرے کو بیچتے وقت یہ بتلاتا ہے کہ یہ چیز اسے کتنے میں پڑی اور وہ اس پر کتنا نفع

(Profit) لے رہا ہے۔

ایک سادہ بیع (Simple Sale) اور مرابحہ کے اندر فرق یہ ہے کہ سادہ بیع کے اندر سامان بیچنے والا شخص (Seller) یا سپلائر (Supplier) اپنی چیز کی ایک متعین قیمت بتلاتا ہے، اس میں یہ وضاحت نہ کرتا کہ وہ چیز اسے کتنے میں پڑی اور وہ اس پر کتنا نفع رکھ کر آگے بیچ رہا ہے، (اس کو ''بیع المساومۃ'' بھی کہتے ہیں) جبکہ مرابحہ کے اندر فروخت کنندہ (Seller) خریدا کو چیز کی وہ لاگت بھی بتلاتا ہے، جس پر اس نے خریدی اور یہ بھی بتلاتا ہے کہ وہ اس پر کتنا نفع لے کر آگے فروخت کر رہا ہے، گویا یہ لاگت اور نفع (Cost+Profit) پر کسی چیز کی بیع (Sale) ہے۔

بنیادی طور پر تو مرابحہ ایک خرید و فروخت کا عقد ہے، کوئی طریقۂ تمویل (Mode of Finance) نہیں، لیکن عصر حاضر میں اسلامی بینکاری کے اندر اسے چند شرائط کے ساتھ بطور طریقہ تمویل اکثر استعمال کیا جاتا ہے۔

ذیل میں بطور طریقۂ تمویل مرابحہ کا جائزہ پیش کیا جاتا ہے:

طریقۂ کار (Procedure):

اسلامی بینکوں میں مرابحہ کے نام سے جو ٹرانزنکشن (Transaction) کی جاتی ہے، اس میں صرف مرابحہ نہیں ہوتا، بلکہ اور بھی بہت سے معاملات (Contracts) ہوتے ہیں، لیکن چونکہ دوسرے معاملات (Contracts) اسی مرابحہ کی تکمیل کے لئے عمل میں آتے ہیں اس لئے اس پورے عمل کو ''مرابحہ'' کا نام دیا جاتا ہے۔

اس کی عملی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً ایک شخص کو کوئی سامان خریدنے کے لئے رقم کی ضرورت ہے وہ اگر عام سودی بینک کے سامنے اپنی اس ضرورت کا اظہار کرے تو سودی بینک اسے سودی قرضہ دے گا اور متعین قسطوں میں قرض مع سود وصول کرے گا۔

لیکن اسلامی بینک اس کی یہ ضرورت پوری کرنے کے لئے خود ہی وہ چیز بازار سے

خریدے گا یا اسے مطلوبہ چیز خریدنے کے لئے اپنا وکیل بنائے گا، بینک کے وکیل کی حیثیت سے جب یہ شخص (Client) مطلوبہ چیز خرید کر اس پر قبضہ کرے گا تو بینک مرابحہ کے طریقہ پر وہ چیز اسے بیچ دے گا کہ یہ چیز اتنے میں پڑی ہے اور اس پر اتنا نفع رکھ کر میں آپ کو یہ بیچ رہا ہوں، کلائنٹ قیمت کی ادائیگی یکمشت یا قسطوں میں کرے گا۔

مرابحہ کی مشروعیت:

مرابحہ کی مشروعیت انہی دلائل سے ثابت ہے، جن کے ذریعہ خرید وفروخت کی مشروعیت پر استدلال کیا گیا ہے، مثلاً اللہ تعالی کا قول : "**وأحل الله البيع**" (سورہ بقرہ: ۲۷۵) (اللہ تعالی نے بیع کو حلال کیا ہے)۔ بعض حضرات نے مرابحہ کی مشروعیت پر اللہ تعالی کے قول "**ليس عليكم جناح أن تبتغوا فضلاً من ربكم**" (سورہ بقرہ: ۱۹۸) (تم پر کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے رب کے فضل میں سے کچھ طلب کرو) سے اس پر استدلال کیا ہے کہ ربح (نفع) ہی فضل ہے۔ اسی طرح مرابحہ کی مشروعیت کے لئے بیع تولیہ پر قیاس کے ذریعہ استدلال کیا گیا ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سفر ہجرت کے لئے بیع تولیہ کے ذریعہ اونٹنی خریدی؛ کیونکہ جب حضرت ابوبکرؓ نے آپ ﷺ کو اونٹنی ہبہ کے طور پر دینی چاہی تو آپ ﷺ نے فرمایا : "بلکہ میں ثمن کے ساتھ لیتا ہوں" (صحیح البخاری: کتاب مناقب الانصار ر ۳۵۰۵/ ۳۹۰۶)۔

اہل علم کی اکثریت کا مرابحہ کی مشروعیت پر اتفاق ہے۔

چنانچہ "فقہ اکیڈمی انڈیا" کا یہ فیصلہ ہے کہ اسلامی بینکوں میں مرابحہ کی استعمال ہونے والی شکلیں اس کی معروف شرطوں کے ساتھ اسی صورت میں جائز ہوں گی جب کہ:

الف: بینک کی طرف سے جاری کردہ مخصوص فارم (Quotation) میں بینک کے ذریعہ فروخت کی جانے والی اشیاء کی نوعیت، ان کی کیفیت (Quality) اور دوسری ضروری صفات واضح طور پر ذکر کی گئی ہوں؛ تاکہ جہالت اور ابہام کی وجہ سے معاملہ کے ہر دو فریق

کے درمیان کسی نزاع کا امکان باقی نہ رہے اور اس قیمت خرید یا لاگت پر بینک کو ملنے والے نفع (قیمت)، اس کی ادائیگی کی مدت اور اقساط کی صراحت کر دی گئی ہو۔

ب: یہ درست نہیں ہوگا کہ معاملہ کرتے وقت یہ کہا جائے کہ اگر نقد خریدا جائے تو یہ قیمت ہوگی اور ادھار خریدا جائے تو دوسری قیمت، یا ادھار کی مدت کے کم یا زیادہ ہونے پر قیمت کی کمی اور زیادتی کا ذکر معاملہ کرتے وقت کیا جائے، بلکہ بینک خریدار کو مطلوبہ سامان کا نمونہ دکھا کر وضاحت کرے کہ اس کی قیمت اتنی مدت کے اندر اتنی قسطوں میں ادا کرنی ہوگی، اور بینک کو اس کی لاگت پر اتنا منافع دینا ہوگا (اور یہی بینک سے خریداری کی قیمت ہوگی)۔

اجارہ:

اجارہ کی مشروعیت قرآن مجید، احادیث مبارکہ، اجماع اور عقل وقیاس سے ثابت ہے اور اس کے جواز پر فقہاء کا اتفاق ہے۔

اجارہ کی مشروعیت قرآن مجید سے:

قرآن کریم نے اجارہ کی مشروعیت کو مختلف مقامات پر بیان فرمایا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اجارہ سابقہ امم کے ہاں بھی مشروع تھا۔

۱۔ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کا قصہ سورۃ الکہف میں موجود ہے کہ جب آپ دونوں ایک بستی میں پہنچے اور دیکھا کہ دیوار گرنے کے قریب ہے، تو حضرت خضر علیہ السلام نے اسے ہاتھ لگایا اور وہ معجزانہ طور پر ٹھیک ہوگئی، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: "**قال لو شئت لاتخذت علیه أجرا**" (الکہف: ۷۷) کہا (حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے) اگر آپ چاہتے تو اس دیوار کے سیدھا کرنے پر اجرت لے لیتے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اجارہ سابقہ امتوں کے ہاں جائز تھا، اور جو چیز سابقہ امتوں میں جائز ہو، جب تک اس کے معارض کوئی دلیل نہ ہو، وہ جائز ہی رہتی ہے۔

۲۔ارشادربانی ہے :"فإن أرضعن لكم فآتوهن أجورهن" (الطلاق:۶) (پس اگروہ تمہارے کہنے سے دودھ پلائیں توتم ان کوان کی اجرت دو)۔

مذکورہ آیت میں اللہ تعالی نے فرمایا: اگرعورت کوطلاق ہوچکی، لیکن خاوند چاہتا ہے کہ شیرخوار بچے کویہی عورت دودھ پلائے، تواب خاوند پرلازم ہے کہ وہ اس عورت کودودھ پلانے کےعوض اجرت بھی اداکرے۔یہ آیت بھی اجارہ کی مشروعیت کوثابت کرتی ہے۔

اجارہ کی مشروعیت احادیث مبارکہ سے:

احادیث مبارکہ سے بھی اجارہ کی مشروعیت ثابت ہے، درج ذیل احادیث اجارہ کے جواز کوثابت کرتی ہیں:

ا۔حضرت ابوہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ اللہ تعالی فرماتا ہے :**"ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة :رجل أعطى بي ثم غدر، ورجل باع حراً فأكل ثمنه، ورجل استأجر أجيراً فاستوفى منه ولم يعطه أجره"** (بخاری، محمد بن اسماعیل، ابوعبداللہ، الجامع الصحیح، دارابن کثیر بیروت ۱۴۱۰ھ، کتاب الاجارہ، باب اثم من منع أجرالأجیر، حدیث:۲۲۷۰)۔

(میں روزقیامت تین لوگوں سے جھگڑاکروں گا، ایک وہ شخص جومیرانام لے کرعہد کرے اور پھرتوڑدے، دوسراوہ شخص جس نے کسی آزادآدمی کوفروخت کرکے اس کی قیمت کھائی، اورتیسراوہ شخص جس نے کسی مزدورکواجرت کے لئے رکھا، اس سے کام توپورالیا، لیکن اس کواجرت نہ دی)۔

۲۔حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشادفرمایا :**"إذا استأجرت أجيراً فاعلمه أجره"** (جب توکوئی مزدورکرائے پرلےتواس کی مزدوری اس کو بتادے)۔

اجارہ کی اہمیت اورضرورت:

عصرحاضر کےحوالہ سےاجارہ کی اہمیت وضرورت کوڈاکٹرمولانامحمدزبیراشرف عثمانی

مدظلہ‘‘ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

’’عقد اجارہ کا تصور زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے، اور ہر دور میں اجارہ ہوتا رہا ہے، چنانچہ قرآن کریم میں بھی حضرت موسیٰؑ کے واقعہ میں عقد اجارہ کا تذکرہ آیا ہے، اور خود حضرت موسیٰؑ نے بھی اجارہ کیا ہے، چونکہ اجارہ کا ثبوت قدیم ہے، اور اس وقت سے لے کر آج تک اجارہ کا عمل ہورہا ہے، اس لئے اجارہ کی صورتیں ہر زمانہ میں بدلتی رہی ہیں، اور اس میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہی ہیں۔ آج کل ہمارے معاشرہ میں عقد اجارہ بہت کثرت سے ہورہا ہے، اور بے شمار حضرات صرف ناواقفیت کی وجہ سے عقد اجارہ کو فاسد کردیتے ہیں، جس کی وجہ سے پورا عقد ناجائز ہوجاتا ہے، نیز آج بینکوں اور اکثر مالیاتی اداروں (Investment Companies) میں اجارہ کا استعمال بکثرت ہورہا ہے، اس لئے اس بات کی اہمیت اور ضرورت محسوس کی جارہی ہے کہ اس موضوع کی تحقیق کی جائے۔

چونکہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جس میں ملازمت، صناعت، تجارت، معیشت، معاشرت، غرض یہ کہ زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق ہدایات اور رہنمائی موجود ہے، معیشت اور تجارت موجودہ زمانہ کی اہم ضروررت ہے؛ کیوں کہ یہ زندگی کا اہم ترین شعبہ ہے، بلکہ انسانی زندگی کی ضرورت کے ساتھ ساتھ معاشرہ کی ضرورت بھی اس سے وابستہ ہے، اس معیشت کا ایک شعبہ اجارہ (Leasing) بھی ہے، اس کا استعمال معاشی اور صنعتی اداروں میں کثرت کے ساتھ ہوتا ہے، اور یہ موضوع ملازمت، مزدوری کے مسائل، تجارت، کرایہ داری، خدمات، کارخانوں، دکانوں، مکانات، اور اس کے علاوہ بے شمار معاشرہ کی ضروریات پر محیط ہے‘‘ (جدید معاشی نظام میں اسلامی قانون اجارہ/ ۳۴)۔

اجارہ بطریقۂ تمویل:

اجارہ میں چوں کہ معقود علیہ معدوم ہوتا ہے، اس لئے قواعد کے مطابق یہ عقد درست نہیں ہونا چاہئے، مگر لوگوں کی حاجت اور ضرورت کے پیش نظر شریعت میں اس کو مشروع رکھا

گیا، البتہ اب اجارہ کو مالیاتی اداروں نے سودی بنیاد پر طویل المیعاد قرضے دینے کا متبادل سمجھ کر اسے بطور طریقۂ تمویل استعمال کرنا مشروع کر دیا ہے، اس طرح کی لیز کو عموماً تمویلی اجارہ (Financial Lease) کہا جاتا ہے، جو کہ عملی اجارہ (operational Lease) سے مختلف ہے، اور اس (فائنانشیل لیز) میں عملی اجارہ کی بہت سی خصوصیات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

البتہ اسلامی بینکاری میں رائج اجارہ "اجارہ منتہیۃ بالتملیک" (Hire Purchase) شرعی اجارہ سے مختلف ہے۔ اجارہ منتہیہ بالتملیک کا یہ عمل کب اور کہاں سے شروع ہوا؟ اس بارے میں ابراہیم دسوقی "البیع بالتقسیط و البیوع الائتمانیۃ الأخری" میں رقمطراز ہیں: "اجارہ منتہیۃ بالتملیک ۱۸۴۶ء میں (Hire Purchase) کے نام سے انگلینڈ میں شروع ہوا، دراصل لوگ آلات موسیقی کرایہ پر لیتے تھے، پھر کرایہ کے ساتھ ساتھ اس عمل میں تیزی آتی گئی یہاں تک کہ وہاں کے لوگوں نے (Hire Purchase) پر دے کر ضروریات زندگی بھی حاصل کرنا شروع کر دیں۔ ۱۹۵۳ء میں امریکہ میں (Leasing) کے نام سے، ۱۹۶۲ء میں (Credit Bail) کے نام سے فرانس میں شروع ہوا، یہ عمل روز بروز بڑھتا چلا گیا، یہاں تک کہ اسلامی ممالک میں مالیزیا (ملیشیا)، مصر اور ایران میں بھی اس کی ابتداء ہوگئی۔ اجارہ منتہیہ بالتملیک کے عمل کو اسلامی ممالک کے اندر اس قدر تیزی سے ترقی حاصل ہوئی کہ ۱۴۱۰ھ تک ۲۰ سے زیادہ اسلامی ممالک میں اس (اجارہ منتہیۃ بالتملیک) کے ذریعہ لاکھوں لوگ اس طریقہ کار سے مستفید ہونے لگے۔

حافظ ذوالفقار علی اس بارے میں لکھتے ہیں:

لیزنگ (اجارہ) کو بطور تمویل استعمال کرنے کا تصور ماضی قریب کی پیداوار ہے، جسے ۱۹۵۰ء کی دہائی میں ایک امریکی مالیاتی ادارے نے متعارف کرایا۔ اس سے پہلے لیزنگ کا بحیثیت مالیاتی سہولت کے کہیں تذکرہ نہیں ملتا۔ اسے زیادہ مقبولیت ۱۹۶۰ء کے عشرہ میں

حاصل ہوئی، جب فرانس کے مالیاتی اداروں نے امریکی نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے ہاں اس کا آغاز کیا۔

اجارہ اور اجارہ منتہیہ بالتملیک کی مشروعیت پر بنیادی باتیں:

اس کی مشروعیت پر اجماع بھی ہو چکا ہے، اس کے جواز کی عقلی وجہ یہ ہے کہ اس میں لوگوں کے لئے آسانی ہے کہ وہ ان اثاثوں کی منفعت اجارہ کے معاہدے کے ذریعہ حاصل کر لیتے ہیں جن کی ملکیت حاصل کرنے کی وہ طاقت نہیں رکھتے۔

اجارہ منتہیہ بالتملیک بھی تو ایک اجارہ کا معاہدہ ہی ہے جس پر اجارہ کے تمام احکام لاگو ہوتے ہیں، بس اس کے ساتھ مدت کے اختتام پر ملکیت کی منتقلی کا وعدہ منسلک ہو گیا ہے، اس کی مشروعیت کی توثیق مجمع الفقہ الاسلامی کی قرارداد سے بھی ہوتی ہے جس میں اجارہ منتہیہ بالتملیک کی جائز و ناجائز صورتوں کو بیان کیا گیا ہے۔

مساقات ومزارعت:

مساقات یہ ہے کہ آدمی کوئی درخت ایسے شخص کو دے جو اس میں کام کرے اور اس کا پھل دونوں کے درمیان تقسیم کیا جائے گا۔

عقد مساقات کے صحیح ہونے نہ ہونے میں اس کے شرائط اور اس کے وقت کے تعیین وتحدید کو لے کر فقہاء کے درمیان اختلاف ہے، جمہور فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ وقت کا مجہول ہونا جائز نہیں۔

لیکن مساقات کے مسئلے میں ابن عاشور نے مالکیہ کے قول کو راجح قرار دیا ہے، جنھوں نے درخت اور کھیتی میں جہاں عمل کی ضرورت ہو، مساقات کو جائز قرار دیا ہے، انہوں نے اپنی ترجیحی دلیل میں بدن پر منعقد ہونے والے معاملات میں شریعت کے جو مقاصد ہیں ان سے مدد لی ہے۔ چنانچہ ان مقاصد میں ان معاملات کی تکثیر بھی ہے، جو اس بات پر دلالت کرتی

ہے کہ ان میں غرر کو نظر انداز کیا جائے گا، تا کہ ضروری مصالح کی رعایت کی جا سکے۔ ابن عاشور نے اس شرعی مقصد (یعنی تکثیر معاملات) پر اعتماد کرتے ہوئے امام مالک کے قول کو راجح قرار دیا ہے، اس کے مقابلے میں اس قول کو ضعیف قرار دیا ہے جس میں مساقات کو کھجور اور انگور کے بیل تک محدود رکھا گیا ہے، جو امام شافعی کا قول ہے'' (نظریہ مقاصد ابن عاشور کے نزدیک/ ۳۰۴)۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی لکھتے ہیں:

''مکہ کے تجارتی ماحول میں تو شرکت اور مضاربت کی اہمیت زیادہ تھی، مگر مدینہ میں زراعت کے بھی مواقع تھے، چنانچہ مزارعت اور مساقات کا بھی چلن تھا، نبی کریم ﷺ سے متعدد حدیثیں مروی ہیں جن کا منشا مضاربت، مزارعت، اور مساقات کو ابہام، جہالت اور عدم تعین سے پاک رکھنا، اور منصفانہ بنیادوں پر استوار کرنا تھا'' (مقاصد شریعت/ ۲۱۵)، بلکہ ابن عاشور تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ''بدن پر منعقد ہونے والے تمام معالات بدن کا اجارہ، مساقات، پودا لگانا، مضاربت، اور مزارعت محض قول سے لازم نہ ہوں، بلکہ عمل شروع کرنے پر لازم ہوں، اس کی دلیل یہ ہے کہ ان معاملات میں شریعت کا مقصد یہ ہے کہ محض قول سے ان کے شروع ہونے تک ان میں اختیار باقی رہے گا'' (مقاصد الشریعۃ/ ۸۔۲۰۶)۔

استصناع:

عقد استصناع کی مشروعیت اور اس کا حکم شرعی:

جہاں تک عقد استصناع کا تعلق ہے تو نصوص شرعیہ، قیاس اور عقل کے اعتبار سے عقد استصناع ناجائز ہے؛ کیونکہ یہ ایک معدوم شئی کی بیع ہے اور معدوم ناجائز ہے، کیوں کہ جو چیز انسان کے قبضہ میں نہ ہو اس کو فروخت کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے، البتہ صرف عقد سلم کو معدوم ہونے کے باوجود جائز قرار دیا ہے، لیکن بہ ایں ہمہ تعامل ناس، عرف وعادت اور اجماع کی وجہ سے عقد استصناع کو استحساناً جائز قرار دیا گیا ہے، اور یہ تعامل

دور نبوت سے آج تک بلا کسی نکیر و انکار کے ثابت اور جاری و ساری ہے، اور یہ تعامل فرمان نبوی : ''**لاتجتمع أمتی علی ضلالة**'' (ترمذی: ۳۹۰۲ باب لزوم الجماعۃ) کے عموم میں داخل ہے اور آپ ﷺ کے اقوال و افعال سے بھی تعامل کا ثبوت ملتا ہے، آنحضور ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی بنوائی تھی اور پچھنے لگوائے تھے، حالانکہ عمل حجامت کی مقدار اور فاسد مادہ کو کتنی بار نکالے گا، یہ آپ کو معلوم نہیں تھا، لیکن عمل حجامت کا علم تھا کہ وہ اس قدر ہو کہ فاسد مادہ باقی نہ رہے۔ اس طرح آپ ﷺ کو حمام کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے مردوں کے لئے ستر پوشی کے ساتھ نہانے کو مباح قرار دیا، حالانکہ آپ ﷺ کو یہ معلوم نہیں کہ نہانے والا کتنا پانی استعمال کرے گا؟ اور کتنی دیر غسل خانے میں رہے گا؟ البتہ نہانے کا عمل معلوم ہے تو ان تمام امور کا جواز تعامل ہی کی بنا پر ہے۔ دلائل درج ذیل ہیں:

۱۔ ''**عن أنس رضی اللہ عنہ أن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتخذ خاتماً من فضة ونقش فیه محمد رسول الله**'' (نسائی شریف ۲/ ۳۴۵، کتاب الزینۃ)۔

۲۔ ''**عن ابن عباس رضی اللہ عنہ أن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احتجم وأعطی الحجام أجرة**'' (مسلم شریف ۲/ ۳۲۵)۔

۳۔ ''**عن جابر رضی اللہ عنہ أن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قال : من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلايدخل حليلته الحمام ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يدخل الحمام بغير إزار**'' (ترمذی ۲/ ۱۰۷ باب ماجاء فی دخول الحمام)۔

۴۔ ''**وأما جوازه فالقياس أن لا يجوز لأنه بيع ما ليس عند الإنسان، لا على وجه السلم وقد نهى رسول الله صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن بيع ما ليس عند الإنسان ورخص في السلم، ويجوز استحساناً لإجماع الناس على ذلك، لأنهم يعلمون ذلك في سائر الأعصار من غير نكير، وقد قال عليه الصلاة والسلام : لا تجتمع أمتي على ضلالة، وقال عليه الصلاة والسلام : ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن، والقياس يترك بالإجماع الخ**'' (بدائع ۴/ ۹۳-۹۴)۔

عقد استصناع کے لئے ضابطہ اور اصول:

عقد استصناع کا جواز چونکہ عرف وعادت اور تعامل ناس پر مبنی ہے، لہذا جن اشیاء میں تعامل اور عرف پایا جائے گا، ان اشیاء میں عقد استصناع جائز ہوگا، خواہ وہ اشیاء معمولی ہوں، چھوٹی ہوں یا بڑی ہوں، جبکہ ان کی نوع، صفت اور مقدار کو بیان کرنا ممکن ہو، البتہ ازمان واعصار کے مختلف ہونے سے تعامل مختلف ہوسکتا ہے، مثلاً زمانہ قدیم میں تعامل ٹوپی، خفین جیسی اشیاء میں تھا اور موجودہ زمانہ میں فلیٹ، فیکٹری، مکان، گاڑی وغیرہ جیسی اشیاء میں تعامل ناس جاری ہے، لہذا موجودہ زمانہ میں چھوٹی بڑی اشیاء میں تعامل ناس اور عرف وعادت کی وجہ سے عقد استصناع شرعاً جائز ہوگا، اور جن اشیاء میں تعامل جاری نہ ہو ان اشیاء میں حکم قیاس کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔

اسی لئے استصناع کے عقد کو اس انداز سے کرنا جائز نہیں ہے کہ اسے محض سودی سرمایہ کاری کا ذریعہ بنالیا جائے، اس کے ناجائز ہونے کی بنیاد یہ ہے کہ حرام معاملات سود، شبہ سود اور بیوع عینہ وغیرہ میں ملوث ہونے سے بچا جاسکے۔

استصناع اور اس کی ضمانتیں:

جن اشیاء میں صنعت کا عمل دخل نہ ہو، ان میں استصناع کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسی اشیاء مثلاً حیوانات، پھل اور سبزیاں وغیرہ استصناع کی حقیقت اور تعریف کے تحت نہیں آتی ہیں؛ کیونکہ استصناع اس سامان کو فروخت کرنے کو کہتے ہیں جس میں انسانی صنعت پائی جائے۔

انسانی صنعت سے تیار شدہ اشیاء (چاہے ان کا مثل بازار میں عام دستیاب ہو یا عام دستیاب نہ ہو) میں استصناع کا عقد اس لئے جائز ہے کہ لوگ اکثر ایسی ہی اشیاء میں استصناع کا عقد کرتے ہیں اور چوں کہ شریعت کے وہ احکام جن کی بنیاد عرف پر ہو، ان میں عرف کے

بدلنے سے تبدیلی آجاتی ہے، لہذا ہر اس شئی میں استصناع کا عقد کرنا جائز ہے جس میں لوگوں کا تعامل ہو اور اس کی مکمل صفات بیان کرنا ممکن ہو، چاہے وہ اشیاء استعمال سے خرچ ہوجاتی ہوں یا باقی رہتی ہوں۔

کسی مخصوص اور متعین شئی میں استصناع کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ استصناع کا عقد ایسی چیز کے لئے کیا جاتا ہے جو کسی کے ذمہ میں واجب ہو، اگر استصناع کا عقد کسی متعین شئی کے لئے کیا گیا تو یہ ایسی شئی کی فروخت کا عقد ہوگا جو فروخت کنندہ کی ملکیت میں نہیں ہے، اور ایسا کرنے سے نبی اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ ''جو چیز تمہارے پاس نہ ہو اسے فروخت نہ کرو'' (سنن الترمذی ۳/ ۵۳۴، تحقیق احمد شاکر، ارواء الغلیل للالبانی ۵/ ۱۳۲)۔

اس ممانعت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ عموماً مصنوع ایسی شئی کو کہا جاتا ہے جسے عدم سے وجود میں لایا جائے، لہذا یہ ممکن نہیں ہے کہ مصنوع متعین ہو، اور معدوم کا تعلق ذمہ سے ہوتا ہے، اور جو ذمہ میں آئے وہ دین کہلاتا ہے (مجلۃ الاحکام العدلیہ، مادہ: ۱۵۸)۔

عقد سلم:

سلم بھی خرید وفروخت کی ایک شکل ہے، اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ قیمت نقد ادا کردی جائے اور خریدی جانے والی شئی ادھار رکھی جائے۔ اس کو شریعت کی اصطلاح میں ''سلم'' کہتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو وہاں ایسی خرید وفروخت کا عام رواج تھا، آپ ﷺ نے اس کی اجازت دی، لیکن فرمایا کہ پیمانہ متعین ہونا چاہئے، وزن متعین ہونا چاہئے، اور مدت متعین ہونی چاہئے، ''**من أسلف فی شیئ ففی کیل معلوم، ووزن معلوم إلی أجل معلوم**'' (صحیح البخاری، کتاب السلم، باب السلم فی وزن معلوم، حدیث نمبر: ۲۲۴۰)۔

اور بھی دیگر تفاصیل اس سلسلے میں فقہ کی کتابوں میں فقہاء نے درج کی ہیں، چونکہ شریعت کا منشا ومقصد نزاع کو روکنا اور جھگڑے کا سد باب کرنا ہے، اس لئے ان تمام چیزوں کا

متعین اور واضح ہونا ضروری ہے جن کے بارے میں آئندہ اختلاف ہوسکتا ہے، جو شئی ادھار ہو، وہ متعین ہو جیسے چاول، گیہوں، پھر اس کی قسم بھی متعین ہو جیسے باسمتی چاول، کوالٹی اور کیفیت میں بھی ابہام نہ ہو جیسے اعلی درجہ، درمیانی درجہ وغیرہ۔

سامان کی ڈیلیوری کی جگہ بھی متعین ہو، مثلاً یہ چیز فلاں شہر میں مہیا کی جائے گی وغیرہ۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی لکھتے ہیں:

''اصولی بات اور شریعت کا بھی مقصود اس سے یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہو، معاملات میں عدم تعیین، جہالت عدم علم) سے بچنا لازم ہے، کیونکہ اس سے جھگڑے پیدا ہوتے ہیں؛ بلکہ ایسی صورت بھی پیدا ہوسکتی ہے کہ معاملہ کا ہر فریق یہ سمجھے کہ اس پر ظلم ہوا ہے، اور چونکہ معاملہ کے دونوں فریقوں کے سامنے صورتحال واضح نہیں رہتی، اس لئے وہ اطمینان سے معاملہ نہیں کرسکتے جس سے کارکردگی کم ہوسکتی ہے'' (مقاصد شریعت: نجات اللہ صدیقی)۔

سلم کے جواز کی حکمت:

عقد سلم کے جواز میں یہ حکمت ہے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے سرمایہ حاصل کرنے میں آسانی ہوجاتی ہے، کیونکہ زراعت اور تجارت پیشہ حضرات کو اپنے کاروبار کی تکمیل اور ذاتی مقاصد کے لئے بھی خرچ کی تنگی کی وجہ سے مال کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ سلم کے جائز ہونے کی وجہ سے ان کو اخراجات کے حصول میں اور خریدار کو سامان کا نرخ کم ہونے کی وجہ سے اشیاء کی خرید میں آسانی ہوجاتی ہے؛ کیونکہ سلم میں سامان اکثر عام بازار کے نرخ سے کم پر دستیاب ہوجاتا ہے۔

عقد سلم ان افراد کے ایک بہت بڑے طبقہ کی ضروریات کو ان کے مختلف درجات چھوٹے، درمیانے اور بڑے کے لحاظ سے پورا کرتا ہے، جن کو زرعی، صنعتی اور تجارتی مقاصد وغیرہ کے لئے سرمایہ درکار ہو۔ ان تمام کاموں میں پیداوار کی تیاری تک نقد کی شکل میں بھی اور

اشیاء کی صورت میں بھی سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، لہذا سلم سرمایہ کاری کے لئے نقد تمویل فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح اس شخص کی ضرورت کو پورا کرتا ہے جس کو سرمایہ کی ضرورت ہو، بشرطیکہ وہ بھی اس کے مقابل چیز کی بوقت میعاد ادائیگی پر قادر ہو۔ سلم کا استعمال اگرچہ زرعی شعبوں میں زیادہ ہے، لیکن اس کا جواز ان تک محدود نہیں ہے، بلکہ اسے سرمایہ کاری کے دوسرے مواقع جیسے صنعت وتجارت میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ سلم نقدی کی فوری ضروریات کو پورا کرنے کے لئے استعمال ہوسکتا ہے، جس میں فروخت کنندہ کو سرمایہ کے استعمال کی آسانی ہوتی ہے اور مناسب وقت مل جاتا ہے کہ وہ اس کے عوض (مسلم فیہ) کو مقررہ وقت تک فراہم کردے۔

خلاصہ

اسلامی نظام معیشت کے بنیادی خدوخال:

اسلام نے ایک متوازن اور مربوط معاشی نظام استوار کیا ہے، جو ایک طرف افراد معاشرہ کی معاشی اختیارات کی تسکین کا مؤثر اہتمام کرتا ہے، تو دوسری طرف انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی میں کامل ہم آہنگی پیدا کرتا ہے، ذیل میں اسلامی نظام معیشت کے اہم بنیادی خدوخال بیان کئے جائیں گے۔

۱۔حصول رزق کے لئے حلال ذرائع کا استعمال:

اسلام نے انسان کو حصول رزق کے لئے مقدور بھر جدوجہد کرنے پر ابھارا ہے، طفیلی پن اور گداگری جیسے مذموم رجحانات کی بیخ کنی کی ہے، تاہم حصول معاش کی جدوجہد کے لئے یہ لازم قرار دیا ہے کہ وہ ساری دوڑ بھاگ رزق حلال کے لئے ہی ہو، ہاتھ کی محنت ہو یا دماغی محنت، تجارت ہو یا صنعت وحرفت، ہر جگہ حلال ذرائع سے ہی روزی کمائی جاسکتی ہے، حرام کمائی کی قطعی ممانعت کردی گئی ہے اور حرام ذرائع مثلاً چوری، رشوت وغیرہ کی سب راہیں بند کردی گئی ہیں۔

چنانچہ ارشاد ربانی ہے:

"یا أیھا الناس کلوا مما فی الأرض حلالاً طیباً ولا تتبعوا خطوات الشیطان إنه لکم عدو مبین" (البقرہ: ۱۶۸) (اے لوگو! کھاؤ جو کچھ زمین میں حلال پاکیزہ ہے اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے)۔

۲۔صرفِ دولت کی ترغیب حدود کے اندر:

حلال ذرائع سے کمائی ہوئی دولت پر اسلام انسان کے حق تصرف کو تسلیم کرتا ہے اور

اسے اس بات کی نہ صرف اجازت دیتا ہے، بلکہ حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ اسے اپنی حقیقی ضروریات پوری کرنے پر صرف کرے، یا معاشرے کے دیگر افراد کو امداد یا عطیہ کے طور پر دے، لیکن صرفِ دولت کے باب میں بھی اسلام معاشرے کے اجتماعی مفاد کے تحفظ کے پیش نظر ضروری پابندیاں عائد کرتا ہے، گویا حلال روزی پر بھی انسان کے مطلق حق تصرف کو تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ فرد کی ذات اور اخلاق و کردار کو تباہ کرنے والی اشیاء مثلاً شراب وغیرہ پر دولت صرف کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔

نیز اسراف وتبذیر کی ہر شکل پر خرچ کرنے کو سختی سے روکا گیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''**کلوا واشربوا ولا تسرفوا إنه لا یحب المسرفین**'' (الاعراف:۳۱) (کھاؤ اور پیو اور حد سے نہ بڑھو، بے شک حد سے بڑھنے والے اسے پسند نہیں)۔

۳۔ مال و دولت جمع کرنے کی ممانعت:

اسلامی نظام معیشت میں حلال ذرائع سے حاصل کردہ دولت کو جائز کاموں میں میانہ روی کے ساتھ صرف کرنے کی تلقین کی گئی ہے، دولت کو جمع کرنے کے رجحانات کی پرزور مذمت کی گئی ہے، بخل اور اکتناز مال جہاں بخیل کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور خیر و برکت کی بہت سی راہیں بند کر دیتا ہے وہاں یہ معاشرے کے لئے بھی وبال بن جاتا ہے، اس سے دولت کا بہاؤ رک جاتا ہے جس سے پیدا شدہ اشیاء پوری طرح فروخت نہیں ہو پاتیں، یہ صورت حال معیشت میں بحران پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے جس سے بالآخر بخیل بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔

۴۔ گردشِ دولت کے فروغ کا اہتمام:

اسلامی نظام معیشت کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ اس میں اس بات کا بڑا مؤثر اہتمام کیا گیا ہے کہ دولت چند طبقات میں محصور و مرکوز ہو کر نہ رہ جائے بلکہ یہ معاشرہ کے زیادہ سے

زیادہ افراد کے درمیان گردش کرتی رہے، جس طرح انسانی خون رگوں میں رواں دواں رہنے سے جسم صحت مند رہتا ہے، اسی طرح معیشت میں دولت کی گردش کا دائرہ جس قدر وسیع ہوگا اسی قدر معیشت صحت منداور مستحکم ہوگی۔

زکوۃ و صدقات کے نظام سے بھی دولت کے ارتکاز کے امکانات بہت محدود ہوجاتے ہیں، تاہم جس نظام معیشت میں ذاتی ملکیت کو روا رکھا گیا ہو وہاں کسب حلال پر حدود وقیود کے باوجود نجی املاک معرض وجود میں آجاتی ہیں اور یوں دولت کے انجماد کی ایک شکل پیدا ہوجاتی ہے، دولت کے اسی جمود کو توڑنے کے لئے اسلام نے تقسیم وراثت کا قانون مقرر کیا ہے، جس قانون کے تحت فوت ہونے والے ہر شخص کی جائیداد اس کے اہل وعیال اور قریبی اعزہ میں تقسیم ہوجاتی ہے۔

خلاصہ:

دراصل اسلام مسلمانوں کو افلاس زدہ نہیں بلکہ معاشی طور پر خوشحال اور مضبوط دیکھنا چاہتا ہے، ویسے بھی خدا کی صفت رزاقیت پر یقین رکھنے والوں کو اقتصادی ومعاشی اعتبار سے خوشحال اور مطمئن ہونا چاہیے کیونکہ خود مال ودولت کی حیثیت قرآن کے الفاظ میں ''قیاما للناس'' کی ہے، یعنی مال ودولت انسان کی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کا ایک اہم وسیلہ ہیں، جس طرح زندگی کے لیے رگوں میں خون کی گردش ضروری ہے اسی طرح زندگی کے لیے مال ودولت، وسائل پیداوار اور معاشی سرگرمیوں کی اپنی اہمیت ہے معاشی زبوں حالی کی وجہ سے بسااوقات انسان کے اخلاقی اقدار، دینی تقاضے، معاشرتی ذمہ داریاں متاثر اور بے معنی سی معلوم ہونے لگتی ہیں، اسی لیے شریعت نے مال کمانے سے بالکل بھی منع نہیں کیا، بلکہ ترغیب وتحریض سے کام لیا ہے، البتہ مال کی ایسی محبت سے ضرور روکا ہے جس کی وجہ سے حق اللہ اور حق العبد کا خیال نہ رکھا جائے، ایسی کمائی دنیا میں ذلت ورسوائی کا سبب بن سکتی ہے اور آخرت کے لیے بھی باعث عتاب ہے۔

اسی لئے ''دولت محض'' کو اسلام لعنت قرار دیتا ہے، اور وہ مالدار جو اس کے جائز

مصرف سے واقف نہیں ہوتے ،اور یا واقف ہونے کے بعد بھی اس کے مطابق خرچ نہیں کرتے تو اسلام ایسی دولت کو مردار، اوران کے طالب کو اس مردہ لاش کو نوچ کھانے والے کتوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا ہے نیز ایسے لوگوں کے لیے یہ خداداد وسائل زندگی تباہی کا سبب بن جاتا ہے جو راہ اعتدال چھوڑ کر اتراہٹ پر اتر آئیں، چنانچہ آئے دن مختلف مواصلاتی ذرائع سے ہمیں یہ دیکھنے اور سننے کو ملتا ہے کہ مال ودولت کی فراوانی چند صاحبان مال کے لیے وبال جان بن گئی اور اس ظالم دولت سے ان سے ہر قسم کا سکھ اور چین چھین لیا اس کی تائید قرآن کریم کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے :"فَلا تُعْجِبْکَ أَمْوالُهُمْ وَ لا أَوْلادُهُمْ إِنَّما يُرِيدُ اللهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِها فِي الْحَياةِ الدُّنْيا وَ تَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كافِرُونَ (توبہ: ۵۵) (ان لوگوں کے مال و دولت اوراولاد کی فراوانی تجھے حیران نہ کردے . خدا تو یہی چاہتا ہے کہ انھیں اس ذریعے سے دنیاوی زندگی میں عذاب دے اور وہ کفر کی حالت میں مریں)۔

اس بات کی مزید وضاحت سورۂ مؤمنون کی آیات ۵۵۔۵۶ میں اس طرح ہے:

"أَيَحْسَبُونَ أَنَّما نُمِدُّهُمْ بِهِ مِنْ مالٍ وَ بَنِينَ ،نُسارِعُ لَهُمْ فِي الْخَيْراتِ بَلْ لايَشْعُرُونَ"۔

(کیا وہ گمان کرتے ہیں کہ ہم نے جو انہیں مال واولاد سے نوازا ہے، اس لیے ہے کہ ان پر اچھائیوں کے دروازے کھول رہے ہیں، ایسا ہرگز نہیں ہے، وہ اس بات کو نہیں سمجھتے)۔

لہذا جس طرح اسلام اپنے متبعین کو دولت جمع کرنے پر زور دیتا ہے اور دنیاوی فائدوں کے حاصل کرنے کا شوق دلاتا ہے، وہیں کسب معاش کے جائز طریقوں، رہنما ہدایات اور خرچ کے مصارف سے بھی آگاہ کردیا ہے تاکہ کسی قسم کی غلط فہمی یا بے اعتدالی کا امکان باقی نہ رہے، کیوں کہ مالداری انسانوں کی ایک ایسی آزمائش ہے جہاں پر اچھے سے اچھے راسخ العقیدہ انسان کے قدم بھی ڈگمگا جاتے ہیں اور پھر وہ رفتہ رفتہ اہل حقوق، اعزہ، واقارب، اولاد، والدین، سماج، دین بلکہ خدا تک کو بھول جاتے ہیں، انجام کار ان کے ساتھ وہ سلوک ہوتا ہے جس کی ترجمانی قرآن نے یوں کی ہے :"وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ

مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا وَ كُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ" (القصص:۵۸) (اور ہم نے بہت سی بستی والوں کو جنہیں اپنے سامان عیش وعشرت پر ناز تھا، ہلاک کر دیا، پھر ان کی بستیاں ان کے بعد شاید و باید ہی آباد ہوسکیں، اب یہ ان کے گھر ہیں جو اُن کے بعد بہت کم ہی آباد ہو سکے اور (آخر) ہم ہی ان کے وارث ہوئے)۔

اسلام میں رہبانیت کی ہمت شکنی:

مطلب یہ کہ ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم رب کی ہدایت کے مطابق اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہوں، اتباع ہدایت تو اس لیے ضروری ہے کہ اس کی خلاف ورزی باعث عذاب ہے جس کی تفصیل ہم نے پچھلے پراگراف میں پڑھ لیا اور نعمت سے استفادہ اس لیے لازم ہے کہ اگر ہم اس سے فائدہ نہ اٹھائیں تو یہ کفران نعمت ہوگا، جو ہمارے لئے خسارہ اور غضب خداوندی کا سبب ہوگا، لہذا ہمیں چاہیئے کہ ہم اللہ کی نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں، کیوں کہ اگر ہم اس سے فائدہ نہ اٹھائیں اور احتراز برتیں تو یہ کفران نعمت ہوگا، چنانچہ فرمان باری ہے :"مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى" (طٰہٰ:۱۲۴) (اور جو میری نصیحت سے بے رُخی برتے گا تو اس کے لئے تنگی و پریشانی والی زندگی ہوگی اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اُٹھائیں گے) گویا ایک ایسے گناہ کا ارتکاب ہوگا جس کی سزا خدا ہی بہتر جانتا ہے، اسی لئے مسلمانوں کو کہیں یہ تعلیم نہیں دی گئی کہ تم ہر وقت ہمیشہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرتے رہو اور صرف روحانی عبادات میں مشغول رہو، اور ایک ہی چیز کے ہو کر اپنے آپ کو مصیبتوں اور ہلاکتوں میں ڈالنے کی کی سعی کرتے رہو، معاذ اللہ اسلام نے کبھی اور کسی جگہ مسلمانوں کو ایسی تعلیم نہیں دی بلکہ اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ نے تو یہ کہا :"وحرموا مارزقهم الله افتراء على الله" (الانعام:۱۴۰) (انہوں نے خدا کی دی ہوئی روزی کو خدا پر افتراء باندھ کر اپنے اوپر حرام کرلیا ہے)۔

اسی طرح قرآن نے کہا :"ورهبانية ن ابتدعوها ما كتبناها عليه" (الحدید:۲۷) (انہوں نے ترک دنیا کو خود ایجاد کرلیا تھا ہم نے ان پر یہ فرض عائد نہیں کیا تھا)، بلکہ اسلام

نے تو انہیں تعلیم دی تھی: ''وأن لیس للإنسان إلا ما سعی'' (النجم:۳۹) (جو جتنی محنت کرے گا اسے اتنا ہی ملے گا" جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام میں رہبانیت کی کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ یہ کہ کر مسلمانوں کو رہبانیت سے دور رہنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے متعدد مرتبہ مسلمانوں کو اس بات سے آگاہ کیا کہ وہ دین کو دنیا سے علیحدہ نہ تصور کریں۔

فقر وفاقہ سے پناہ:

یہی وجہ ہے کہ مذہب اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس نے ہر جائز آسائش کو مسلمانوں کے لیے حلال اور طیب کر دیا ہے اور دین و دنیا کو دیگر مذاہب کی طرح علیٰحدہ نہیں رکھا، یہاں تک کہ مسلمانوں کے سونے، اٹھنے، بیٹھنے اور جدو جہد کرنے کو بھی عبادت میں شمار کیا، یہی وجہ ہے کہ مسلمان دینی رحمتوں کو شامل حال رکھ کر بھی دنیا کے بڑے سے بڑے مدارج حاصل کر کے ثواب اور اجر عظیم حاصل کر سکتا ہے۔ نیز اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے اسلام نے فرق مدارج کو بھی ملحوظ نہیں رکھا، بلکہ بڑے چھوٹے، امیر، غریب اور عالم وجاہل سب کو ایک خط پر کھڑا کر دیا ہے اور حصول کسب کی طاقت رکھنے کے باوجود بھیک مانگنے کو گناہ وذلت قرار دے کر یہ ثابت کر دیا کہ کسب حلال کا حاصل کرنا ثواب ہے اور اس سے گریز کرنا اور حیلہ تراشی کرنا گناہ عظیم ہے۔

غرض یہ کہ مذہب اسلام کی بڑی سے بڑی شخصیت نے کسی بھی طرح کی صنعت وحرفت کو بطور ذریعہ معاش اختیار کرنے میں ذرا بھی عار محسوس نہیں کیا، اسی بنا پر صنعت وحرفت کو وقار بھی ملا اور فروغ بھی حاصل ہوا، حاصل بحث یہ کہ قرآن وحدیث کے ان تمام دلائل وشواہد کے ذریعے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسب یعنی اپنی روزی خود پیدا کرنا انبیاء کی سنت رہی ہے، ان حضرات نے اپنی روزی خود اپنی صنعت وحرفت کے ذریعے پیدا کرنے کی جانب لوگوں کو ترغیب دلائی ہے، کیونکہ اس میں بڑے فائدے ہیں، مثلاً جو شخص اپنی صنعت وحرفت سے کماتا ہے، نہ صرف یہ کہ خود اسے منافع حاصل ہوتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس کی صنعت

وحرفت سے فائدہ پہنچتا ہے، پھر یہ کہ ایسا شخص اپنے پیشے میں مصروف رہنے کی وجہ سے بری باتوں اور لہو ولعب سے محفوظ رہتا ہے، نیز اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی وجہ سے کسر نفسی بھی پیدا ہوتی ہے اس لئے وہ اپنے نفس کی سرکشی سے بھی بچتا ہے اور پھر سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ ایسا شخص کسی کا محتاج نہیں رہتا، کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کرتا، کسی کے آگے جھکتا نہیں اور اسے ایک آبرومندانہ زندگی حاصل رہتی ہے، اس کے برعکس ایک پریشان حال انسان کی کیفیت نفس کچھ اس طرح کی ہوجاتی ہے کہ وہ اپنے خالق ومالک کے بارے میں ہی طرح طرح کے گمان کرنے لگتا ہے، اور پھر ایک دن ایسا آتا ہے کہ ایمان کی یہ نعمت عظمیٰ اس سے سلب ہوجاتی ہے، فقر زدہ شخص کی اسی کیفیت کو آپ ﷺ نے یوں بیان فرمایا ہے : ''**کاد الفقر أن یعود کفرا**'' (البیہقی فی الشعب الایمان ۲/۴۸۶) (فقر وفاقہ کہیں کفر تک نہ پہنچا دے)، جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے یہ دعا مانگی اور امت کو اس کی تعلیم دی ہے : ''**اللھم إني أعوذ بك من فتنه الفقر**'' (بخاری: ۶۳۶۸)۔

''**اللھم إني أعوذ بك من القلة و الفقر و الذلة**'' (رواہ النسائی ۷/۵۴) (کہ اے اللہ میں فقر وفاقہ، قلت رزق اور ذلت وخواری سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں)۔

رزق اللہ کی جانب سے ملنا تو یقینی ہے، مگر اس کے لئے اس کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے چڑیوں کی طرح محنت بھی کرنی ہوگی، اور معاش کے لیے گھر سے نکلنا بھی ہوگا، جیسے بھوکی چڑیا صبح کو فکر معاش میں اللہ پر بھروسہ کرکے اپنے گھونسلے سے نکلتی ہے اور شام کو جب وہ واپس لوٹتی ہے تو اس کا پیٹ بھرا ہوتا ہے، لہذا انسانوں کو چڑیوں سے سبق لیتے ہوئے اس اصول کو اپنانا ضروری ہے، دعا ہے کہ اللہ رب العزت تمام مسلمانوں کو زندگی کے ہر شعبے میں حلال وپاکیزہ رزق کے حصول اور اس کے لئے محنت ومشقت کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین ''**اللھم انفَعْنا بما عَلَّمْتَنا وعلِّمْنا ما یَنفَعُنا وارزُقْنا علماً تنفَعُنا به**''۔